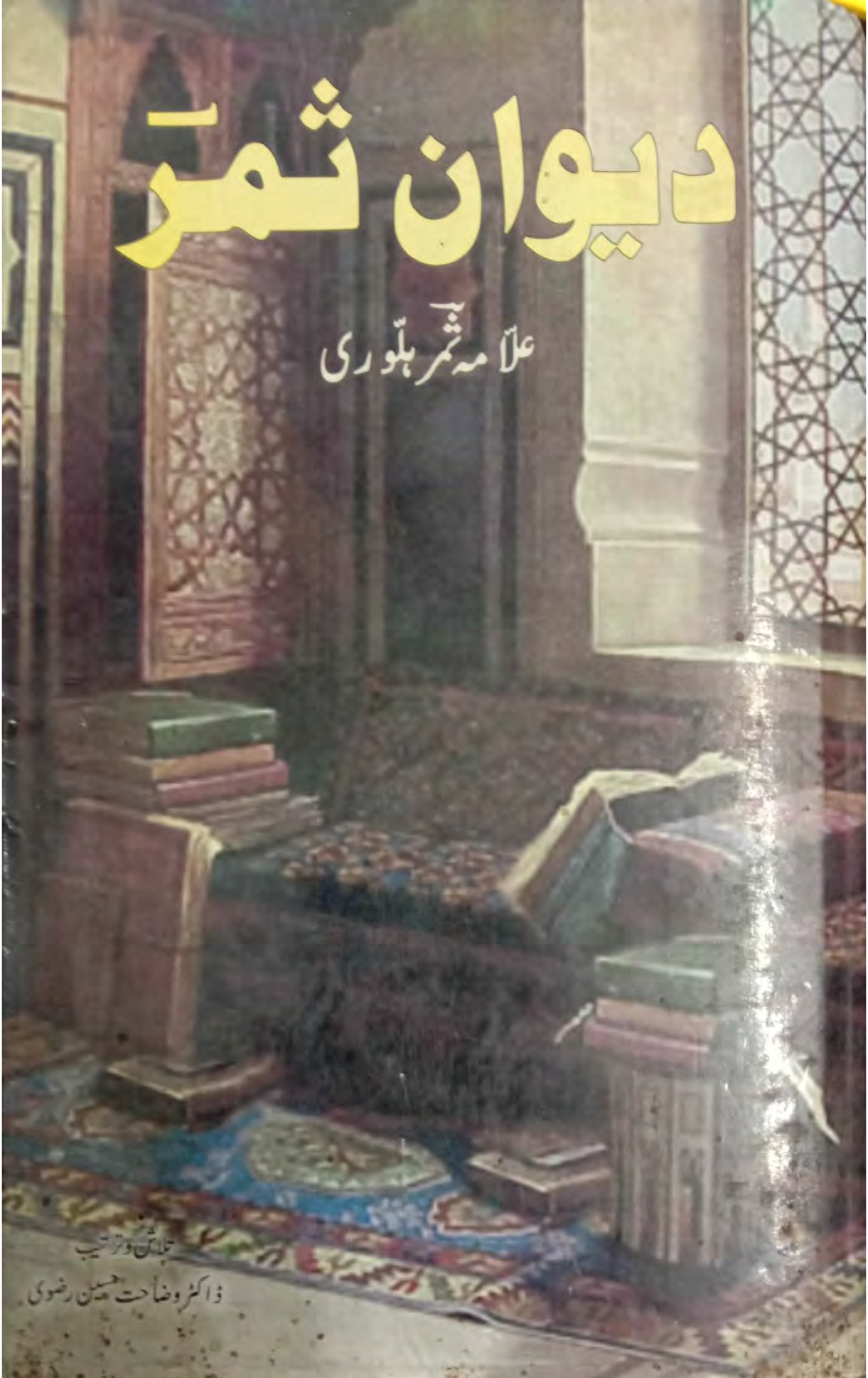
دیوان ثمرؔ

علامہ ثمرؔ ہلوری



تلاش و ترتیب

ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

قمر مرحوم کلاسکی روایات کے پاسدار اور امین تھے ان کا قول تھا کہ ہر تخلیق ڈسپلن کی پابند ہوتی ہے۔ وہ ادب میں اصول پرستی کے نمائندے تھے۔ الفاظ کا انتخاب، اسکی نشست کی دروبست بندشیں، ترکیبیں، محاوروں کا صرف، روزمرہ کی پابندی، شعری روایات، تہذیب کا خیال ولحاظ ان کی ادبی شخصیت کا جزو تھے۔

ـــــ سید مجاور حسین رضوی

اردو کلاسیکی غزل کی جو روایت ولی و میر نے قائم کی اسے غالب و ناسخ نے شہرت عام و بقائے دوام کے دربار میں تمام اصناف سخن کے لیے ایک مثال بنادیا۔ علامہ قمر جلوری کی غزلیں اسی روایت کی توسیع ہیں۔ فنی پختگی اور الفاظ کے برجستہ استعمال نے ان کی غزلوں میں ایک خاص قسم کا رچاؤ پیدا کردیا ہے۔ وہ صرف الفاظ کے خوبصورت دروبست کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ ان کی نغمگی پر بھی ان کا دھیان ہے۔ موجودہ شاعری نے جہاں غزل کی سمت و رفتار میں بہت سی تبدیلیاں کر دی ہیں وہاں قمر جلوری کی غزلوں کا مطالعہ شعری متن کی اس دنیا میں لے جاتا ہے جو آج بھی کلاسیکی غزل کی آبرو ہے۔

ـــــ وقار ناصری

دیوان ثمرؔ

علامہ ثمرؔ ہلوری

تلاش و ترتیب

ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

نام کتاب: دیوان ثمرؔ
شاعر: علامہ ثمرؔ ہلّوری
مرتب: ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی
ناشر: ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی
آر ایس ۳/۱۶، ٹکیٹ رائے کالونی، لکھنؤ۔۱۷
کمپوزنگ: آئیڈیل کمپیوٹر سنٹر، مفتی گنج، لکھنؤ۔۳
کتابت: جناب محبوب حسن
سن اشاعت: ۲۰۰۸ء
طباعت: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج، لکھنؤ۔۳
قیمت: ۱۰۰/- روپے (Rs. 100/-)

ملنے کے پتے

۱۔ دانش محل، امین آباد، لکھنؤ
۲۔ نیو کتاب گھر ہلّور، ضلع سدھارتھ نگر۔۲۷۲۱۹۱



یہ اہلِ فن سے کہو مرا احترام کریں
کہ میرؔ و غالبؔ و انشاؔ کی یادگار ہوں میں

انتساب

امّاں اور ابّا

کے نام

جن کی دعائیں اور تربیت

میرے لیے

گراں قدر سرمایہ ہیں

شجرِ سایۂ دار

علامہ ثمرؔ ہلوری بڑے خوش فکر اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی شاعری نہ صرف زندگی کی حقیقتوں کی ترجمان ہے بلکہ اس میں انسانیت کی اعلیٰ اور ارفع قدروں کی تابانی بھی موجود ہے۔ ان کے فکروفن پر اظہار خیال کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ انفرادیت کا حامل ہے۔ ان کے کلام میں فکر کی بلندی کے ساتھ فن کی پختگی بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں فنی باریکیوں پر خاص نظر رکھتے تھے۔ ان کا اندازِ سخن بڑا دلکش اور اسلوب بیان متاثر کن تھا۔ وہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہے۔ اپنے شاگردوں کو انہوں نے فنی حدود سے باہر جانے کی کبھی اجازت نہیں دی۔ فنِ شاعری کی آبیاری کے لیے انہوں نے الہٰ آباد میں ایک ادارہ 'خیمہ نیم شبی' (جو کہ موصوف کے شاگردوں کی انجمن ہے) قائم کیا اور اسی طرح دوسرا ادارہ 'خیمہ نیم روز'ہلور (سدھارتھ نگر) میں قائم کیا۔ وہ نئے شعراء کی بھرپور ہمت افزائی کرتے۔ ان میں خود اعتمادی پیدا کر کے کئی شاگردوں کو ماہرفن بنایا۔ ان کے شاگرد بھی خاصی تعداد میں ہیں اور ان میں مختلف مکتب فکر کے لوگ شامل ہیں۔ شاگردوں میں بطور خاص شاہ محمود رمزؔ، انورؔ الہ آبادی، نیر عاقل نیرؔ، عابدؔ الہ آبادی، ناصرؔ جونپوری، ملکؔ الہ آبادی، کاوشؔ الہ آبادی، فخرؔ ردولوی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

علامہ ثمر ہلوری کا اصلی نام سید محب الحسن رضوی ہے۔ ان کی ولادت ۱۵؍جون ۱۹۲۷ء کو ہلور ضلع سدھارتھ نگر میں ہوئی۔ وہ عربی، فارسی اردو اور انگریزی زبانوں پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ ہندی زبان سے بھی وہ کماحقہ واقف تھے۔ امامیہ مشن کے تعلق سے انہوں نے کتابچوں کا ہندی میں ترجمے کا کام بھی انجام دیا تھا۔ علم وعروض پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ ماہر لسانیات بھی تھے۔ ان کی علمی اور شعری استعداد مثالی تھی۔ انہوں نے شاعری کا آغاز ۱۹۴۸ء میں نظم سے کیا تھا۔ انہوں نے جن موضوعات پر نظمیں کہیں، ان میں تہذیبی قدروں کی پاسداری کے ساتھ حب الوطنی کے جذبوں کی عکاسی بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی طویل قومی نظموں کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ انہوں نے غزل گوئی بھی سنواری اور اس صنف کو بھی وزن و وقار عطا کیا۔ وہ نظم اور غزل تک محدود نہیں رہے بلکہ ادب کی پیشتر اصناف مثلاً رباعی، سلام اور قصیدے وغیرہ میں بھی انہوں نے بڑی کامیاب طبع آزمائی کی۔ نوحے اور مرثیہ کو بھی انہوں نے اپنی فنی مہارت کے ذریعہ بام عروج پر پہونچادیا، لیکن جو شہرت اور مقبولیت انہیں مرثیہ میں ملی، وہ کسی اور صنف میں حاصل نہیں ہوسکی، کیونکہ وہ مرثیہ نگاری کو ۱۹ویں صدی میں جس بلندی تک لے گئے اردو ادب کی تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کرسکے گی۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی، علامہ ثمر ہلوری سے متعلق اپنے ایک مضمون میں یوں رقم طراز ہیں:

"ثمر ہلوری مرحوم کو جملہ اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی۔ قصیدہ، غزل، رباعی، نظم یہ سب میدان ان کے

توسنِ فکر کی تگ وتاز سے باعزت قرار پائے۔ وہ زود گو اور پُر گو بھی تھے اور لطف یہ تھا کہ فی البدیہہ بھی کہتے وقت وہ اپنے معیار سے گرتے یا ہٹتے نہ تھے۔ انہیں ہمارے کلاسیکی سرمائے اور فارسی زبان و ادب سے کما حقہ، آگاہی تھی اور اپنے تبحّرِ علمی، مطالعہ کے استحضار اور اعلیٰ حافظے کے ثبوت بھی اپنی گفتگو اور کلام میں مہیا کرتے چلتے۔ لیکن اس میں کوئی تصنع نہ ہوتا۔ انہیں عروض اور قافیہ، تاریخ گوئی اور بلاغت کے دوسرے علوم سے بھی لگاؤ تھا۔ ان کا کلام ہمیشہ نک سک سے درست اور خوش آہنگ اور مرصّع ہوتا تھا۔ جس زمانے میں میرا اور ان کا ملنا جلنا کثرت سے تھا اس وقت وہ مرثیے کی طرف (یعنی مرثیہ گوئی کی طرف) زیادہ راغب نہ تھے۔ آہستہ آہستہ انہیں محسوس ہوا کہ ان کا اصل میدان تو مرثیہ ہی ہے اور بقول میر خلیقؔ انہیں اب غزل کو مرثیہ کرنا چاہیے۔ چند ہی برسوں میں وہ ہمارے زمانے کے زبردست مرثیہ گویوں میں شمار ہونے لگے۔''

(نقشِ جاوداں: خورشید ظفر ص۔ ۹)

ثمؔر صاحب کی فکروفن پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر مجاور حسین رضوی لکھتے ہیں:

''ثمؔر مرحوم کلاسیکی روایات کے پاسدار اور امین تھے۔ ان کا قول تھا کہ ہر تخلیق ڈسپلن کی پابند ہوتی ہے۔ وہ

ادب میں اصول پرستی کے نمائندے تھے۔ الفاظ کا انتخاب، اسکی نشست کو دروبست، بندشیں، ترکیبیں، محاوروں کا صرف، روزمرہ کی پابندی، شعری روایات، تہذیب کا خیال ولحاظ ان کی ادبی شخصیت کا جزو تھے۔''

جہاں تک ثمؔر صاحب کی شخصیت کا تعلق ہے وہ کبھی شعر وسخن کے دائرے تک محدود نہیں رہی۔ وہ قوم وملت کی زبوں حالی اور تعلیمی پسماندگی کے لئے بھی ہمیشہ فکرمند رہے بلکہ سرگرم عمل اور فعال بھی رہے۔ خاص طور سے ہلّور میں انہوں نے اپنی کوششوں سے ایک انگریزی اسکول قائم کیا۔ جس کا قیام ۱۹۵۳ء میں عمل میں آیا تھا، جو ماڈرن ہائر سکنڈری کے نام سے موسوم ہوا۔ جہاں تک ثمؔر صاحب کی تعلیمی لیاقت کا تعلق ہے انہوں نے آگرہ یونیورسٹی سے بی۔اے۔ اور الہ آباد یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے۔ کیا۔ فارسی میں ایم۔اے۔ انہوں نے فرسٹ ڈویژن میں کیا۔ ایم۔اے۔ کرنے کے بعد وہ یادگار حسینی انٹر کالج الہ آباد میں استاد مقرر ہوئے اور بعد میں وہیں پرنسپل کے عہدے پر بھی رونق افروز ہوئے۔ ثمؔر ہلّوری نے ۳۰؍اپریل ۱۹۹۲ء کو اس عالمِ آب وگل کو خیرباد کہا۔

جہاں تک ثمؔر صاحب کی غزل گوئی کا تعلق ہے اس کے رنگ وآہنگ، فکروفن، زبان وبیان اور لب ولہجہ کو ان کے چند اشعار کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔

کائنات کی تعمیر وتشکیل اور تزئین کاری جذبۂ عشق کی مرہونِ منت ہے۔ عشق ہی تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ عشق کی گہرائی کو وجدان وعرفان کے

پیمانے سے ہی ناپا جا سکتا ہے۔ عشق کے بارے میں علامہ اقبآل کا خیال ہے:

صدقِ خلیل بھی عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اور حقیقت یہ ہے کہ آفاق کی وسعتیں عشق میں گم ہیں۔ لفظ و بیان کے حوالے سے اس بحرِ بیکراں کا عمق بتا پانا ممکن نہیں۔ شاعر نے سلیس اسلوب میں عشق کو دو مصرعوں میں اس طرح پیش کیا ہے۔

عشق بحرِ بیکراں ہے عشق ہے بحرِ عمیق
کون اندازہ لگا سکتا ہے اس کی تھاہ کا

زندگی حرکت و عمل سے عبارت ہے۔ سارے سماجی رشتے حرکت و عمل کے تابع ہیں جہاں جمود کی کیفیت پیدا ہوئی، سمجھئے زندگی سے موت کا سفر شروع ہوا۔ سب رشتے ناتے ایک خاص حد تک پہنچ کر ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ جیسا کہ ثمؔر صاحب نے فرمایا ہے چالیس قدم کی روایت پر چلتے ہوئے تنہا سفر کے واسطے جانے والے کو رخصت کر دیتے ہیں۔ یہی فلسفۂ حیات اور ابدی حقیقت ہے۔ ملاحظہ ہو:

آشنا جو تھے پسِ مرگ انہوں نے بھی ثمؔر
ساتھ آکر مرے چالیس قدم چھوڑ دیا

پھر اسی فلسفۂ زندگی کو دوسرے انداز میں شعری پیکر عطا کرتے ہوئے محترم ثمؔر صاحب فرماتے ہیں کہ انسان بحثیت مجموعی تین اجزا پر مشتمل ہے۔ یعنی قوتِ عمل جسے انہوں نے بجلی کی تڑپ کہا۔ رواداری، محبت، غمگساری جسے شبنم کی نمی سے تشبیہ دی ہے اور صاف گوئی جسے آئینہ کا جوہر

بتاتے ہیں۔

تڑپ بجلی کی، شبنم کی نمی، آئینہ کا جوہر
مرکب ہے انہیں اجزاء سے شائد دل بھی انساں کا

انسان کا دل جذبۂ انسانیت سے مملو ہے۔ سبحان اللہ!! کیا قدرتِ بیان ہے۔

زندگی و موت کے مابین جو حدود ہیں ان کو بڑے سلیقے سے ثمؔر صاحب نے نظم کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ پہلے مرنے کا حوصلہ پیدا کیا جائے۔ اس کے بعد ہی جینے کا لطف آتا ہے۔ ورنہ بے حوصلہ افراد کی زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔ حوصلہ مندی ہی رعنائی و رنگینی کا دوسرا نام ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:

اس کا جینا ہے موت سے بدتر
جس کو مرنے کا حوصلہ نہ ہوا

زندگی فانی ہے۔ کوئی بھروسا نہیں کہ کب ہوا کے تیز جھونکے سے زندگی کا چراغ گل ہو جائے۔ اس لئے آج کا کام کل پر نہیں ٹالنا چاہیے۔ ثمؔر صاحب نے ایک شعر میں بڑے خوبصورت انداز میں اسی فکر کو واضح کیا ہے کہ وہ وعدے پر آجائیں ورنہ عدم تکمیل وعدہ کی صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ کل میں رہوں یا نہ رہوں۔

ان کا وعدہ درست ہے لیکن
میں ثمر کل ہوا، ہوا نہ ہوا

ترقی کے نام پر جو کچھ سامنے آرہا ہے وہ تہذیب سے ہمیں دور کرتا چلا جارہا ہے۔ بے راہ روی کا یہ عالم ہے کہ نظر کی شرافت زخم خوردہ ہو رہی ہے۔ بشر کو نام نہاد بلندی اور ارتقا رسوا کئے ہوئے ہے۔ دراصل یہ پستیٔ انسان ہے

جسے فروغ بشر کا نام دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

وجودِ ذات کی بے پردگی ارے توبہ
بشر کو خود ہی فروغِ بشر نے لوٹ لیا

جسم ہے تو سایہ لازمی ہے۔ اب ہم جس قدر چاہیں کہ مکمل خلوت حاصل ہو۔ تو یہ ممکن ہی کہاں ہے اس لیے جب تک جسم ہے تو سایہ ضرور ہے اسے جبر حیات بھی کہہ سکتے ہیں۔ جسے شاعر نے بڑی ندرت سے ادا کیا ہے۔

آئی نہ کام کاوشِ تنہائی تمام
مجبور تھا کہ جسم سے سایہ جدا نہ تھا

سجدہ بندگی کی علامت ہے اور رسوم و مذاہب کی ابتدا ہے۔ ہم بندگی کا اظہار سجدے ہی سے کر سکتے ہیں اس لئے رسوم و مذاہب کی قید سے بچ نہیں سکتے۔ لاجواب شعر ہے۔

وہی رسوم و مذاہب کی ابتدا ٹھہرا
جو ایک سجدہ بھٹکتا تھا سنگ در کے قریب

غزل کی خشتِ اول حسن و عشق پر رکھی گئی ہے اور بقول غالبؔ ع
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر ...... سچ پوچھیے تو صنف غزل کی روح حسن و عشق ہے۔ فلسفہ ہو، منطق، یا دوسرے علوم ہوں غزل میں ان کے بیان کے لیے ضروری ہے کہ غزل کی بنیادی روایتوں پر نظر رہنی چاہئے۔ ورنہ وہ تاثیر سے خالی ہوں گے۔ پھر غور کیجیے کہ حسن و عشق کا جذبہ ہی بنیادی اور دائمی جذبہ ہے۔ اور سارے جذبے اس کے تابع ہیں۔ بڑی سے بڑی تبدیلی، بڑے سے بڑے انقلاب کے باوجود حسن عشق کی اہمیت سے روگردانی نہیں برتی

جا سکتی۔ یہ فطری تقاضوں پر مبنی ہے ایک روشن حقیقت ہے۔ غزل زندہ ہے تو اس لیے کہ حسن وعشق کے جذبوں کو قیامت تک کے لیے بقا حاصل ہے۔

تری زلفوں کا تصور جسے ہم کہتے ہیں
ایک ویرانہ بسایا ہوا ہے خوشبو کا

دیکھے سے اس کے مست ہوا جاتا ہوں ثمّرؔ
مرے لیے ہے دلبر آئینہ روشراب

لکھنے کا کام ان سے ثمّرؔ آپ لیں نہ آج
زلفوں سے کل جو کھیلتی تھیں انگلیاں جناب

رخسار پر نگاہ کی نظریں بدل گئیں
پھولوں کی مانگ کی تھی ملا تیر کا جواب

محبوب کی زندگی کا تصور کیا ہے ایک ایسا ویرانہ جو خوشبو سے سرشار و مشک سے بہتر ہے۔ اس کیفیت کو کوئی صاحبِ دل ہی محسوس کرسکتا ہے۔ خوشبو سے بسے ویرانے میں سانس لینا اور ایک حیات بخش فضا میں ڈوب جانا۔ واہ واہ!

علامہ ثمّرؔ نے جہاں غزل میں کھل کر شاعری کی ہے وہ آفاقیت کی حدوں کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایک عجب سرمستی کا عالم ان کے پُرتغزل شعروں سے مترشح ہوتا ہے۔ محبوب کی دید گویا شراب کے نشہ کی مانند ہے۔ جتنا دیکھتے جایئے سرور و کیف بڑھتا جائے گا۔ جن انگلیوں سے محبوب کی زلفوں سے کھیلا گیا ہے اب ان سے لکھنے کا کام نہ لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ کہاں زلفوں کا لمس اور کہاں قلم کا لمس دونوں کی کیفیتوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے واقعی بڑا خوبصورت خیال پیش کیا گیا ہے۔

ہم نے بے خیالی میں ان کے رخسار پر نگاہ ڈالی اور بھرپور نگاہ ڈالی۔ جس کا احساس ہوتے ہی انہوں نے ترچھی نظروں سے ہماری طرف توجہ کی اور ہم لرز گئے۔ ہم تو پھولوں کی آرزو لیے بیٹھے تھے مگر انہوں نے اس کا جواب تیروں سے دیا۔ عمل کتنا خوبصورت تھا مگر ردِعمل دوسری نوعیت کا ہوا۔ یہ محبوبانہ ادا کی کرشمہ سازی ہے۔

حسن نہیں چاہتا کہ اس کی تمام خیالات عاشق پر روشن ہوں۔ اس لیے وہ اپنی گوناگوں صفات کو بدلتا رہتا ہے تا کہ دیکھنے والا کسی رنگ مخصوص زاویہ پر خیال کو مرکوز نہ رکھ سکے اور بدلتی ہوئی صفات اُسے ادھر ادھر بھٹکاتی رہیں۔ یہ تصوف میں فریب شہود ایک مشہور مسئلہ ہے اس کو شاعر نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کرنے کی سعی مستحسن کی ہے اور خوب کی ہے۔ فریب شہود کو مشہور شاعر رازؔ یزدانی (رامپور) نے یوں نظم کیا ہے۔

جلوہ خود اہتمام فریبِ شہود ہے
آنکھوں کے اعتبار پہ سجدہ نہ کیجئے

یعنی جلوہ خود اہتمام کرتا ہے کہ دیکھنے والی نگاہیں فریب کھاتی رہیں اور اصل حقیقت تک نہ پہنچ سکیں۔ ثمرؔ صاحب نے تقریباً یہی بات منفرد انداز میں کہی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

واضح ہوئی نہ مجھ پہ حقیقت جمال کی
دیتے رہے فریب بدلتے ہوئے صفات

یہ شعر اور اسی طرح کے ان کے دوسرے اشعار ایسے ہیں کہ صفحات کے صفحات لکھے جاسکتے ہیں اور تفصیل ہنوز تشنہ رہے گی۔ اس کو شاعرانہ کمال کہتے ہیں۔

ثمرؔ صاحب کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ عصری حقیقتیں اور حالاتِ حاضرہ پر وہ تبصرہ کرتے ہیں اور اپنی قدرتِ کمال کو ظاہر کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

کیا کوئی حادثہ پیش آیا ہے کیا بات ہے آج
لوگ کیوں آئے ہیں گھر پر مرے اخبار سمیت

اس دور کشاکش اور ہنگامہ خیز دنیا میں پے در پے حادثوں کا سلسلہ جاری ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت کون سا سانحہ کیا دل شکن خبر لے کر آ جائے۔ مذکورہ بالا شعر انہیں مضمرات کا آئینہ دار ہے۔ قاصد پھر قاصد ہے کوئی ہمارا غمگسار یا رفیق دیرینہ تو نہیں۔ وہ تو وقت و مصلحت پر نظر رکھتا ہے۔ اس کا کیا اعتبار کریں۔ اب وہاں سے پلٹ کر اور بہانہ بازی سے سمجھا رہا ہے۔ حالانکہ ہم خوب سمجھتے ہیں کہ وہ بات بنا رہا ہے حقیقت کچھ اور ہی ہے بہر نوع ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں کہ اسی کو ذریعہ پیام و سلام بنائے رکھیں۔ چاہے وہ ہمیں وہاں کی صحیح صورتِ حال سے باخبر کرے یا نہ کرے غزل اسی کو کہتے ہیں۔ اب اس طرح کے شعر کہنا دشوار امر ہے۔ یہ ہنر بڑی مشق 'اس دشت کی سیاحی میں' اور عمر گزارنے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ غزل میں تغزل کو سمونا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس دور میں شاید انگلیوں پر گنے جانے والے دو ایک حضرات ہوں گے جو غزل گوئی کے اسرار و رموز جانتے ہیں، حالانکہ عام طور پر اس صنف کو ابتدا میں شاعر آسان سمجھتا ہے مگر حقیقت کھلنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اچھا شعر کہنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ انہوں نے عروس غزل کی

حنا بندی جس چابک دستی سے کی ہے وہ ان کے اندر چھپے ہوئے فنکار کی نشاندہی کی بہترین مثال ہے۔ ثمرؔ صاحب کے غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرماتے ہوئے لطف حاصل کریں:

اپنوں کا خون ہو روا اپنی غرض کے واسطے
چلتا رہے گا بس یوں ہی دہر کا کاروبار کیا

ایسی کچھ پڑ گئی ہم پر کہ خدایا یاد آیا
تنگ کچھ ایسے ہوئے عشقِ صنم چھوڑ دیا

مسلکِ عشق میں تھی دشت نوردی بے سود
بعد مدت کے میں رسم و رہِ منزل سمجھا

تمہاری بزم میں تھا میں بھی سرفراز کبھی
مرے نصیب میں ایسا بھی اک زمانہ تھا

کسی میخانے میں کل آپ سے ملتا جلتا
ہم نے دیکھا ہے ثمرؔ غم کا سراپا کوئی

جو پنہاں ہے ابھی تک سینۂ خورشید زریں میں
ہمارے غم کدے میں اس کرن کی آزمائش ہے

ثمرؔ ہلوری کے چند اشعار مزید پیش کیے جا رہے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

دور حاضر میں ثمرؔ ہوتا نہ گر سینہ سپر
فن کا ہوتا حال کیا اے گردشِ ایام سوچ

ہوگئی بدنظمیوں کی حد ہمارے دور میں
آدمی کا خون سستا اور مہنگا ہے اَناج

جسکی گرج سے ریت کے دل دہلے جاتے تھے
ساحل کے پاؤں پر وہ سمندر پڑا ہے آج

کل ثمرؔ یہ کہہ رہے تھے مجھ سے ارباب شعور
لذتِ فکر و فراست آج کے فن میں نہیں

اپنی طرح سے دہر میں فن کار تنگدست
غالبؔ تھا ایک شخص ثمرؔ میرؔ ایک شخص

ثمرؔ صاحب کے منتشر کلام کی تلاش وترتیب کوئی بڑا کارنامہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ یہ محض ان کے کلام کو محفوظ کرنے اور منظر عام پر لاکرنئی نسل کو اس کی اہمیت وافادیت سے روشناس کرانے کی ادنیٰ سی کوشش ہے۔

مجھے امید ہی نہیں یقین بھی ہے کہ اس دیوان کو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔اس دیوان کی تکمیل میں بھائی خورشید ظفرؔ، جناب شاہ نواز قریشی، رفعت عزمیؔ اور ریحان عباس کا تعاون حاصل رہا۔ ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میری شریک حیات ماہناز فاطمہ کی خصوصی توجہ اس مجموعہ کی اشاعت میں شامل رہی۔

ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

ا

(۱)

کیوں نہ رکھوں میں ہمیشہ وردِ بسم اللہ کا — بندۂ بے دام ہوں اک مردِ حق آگاہ کا
پتھروں کا ذکر کیا پھر بھی یہ ہیں مجھ سے قریب — آسماں تک پہ اثر ہوتا ہے میری آہ کا
ظلم، رشوت، چاپلوسی، بربریّت ہو چکی — دیکھیں اب انجام کیا ہو آگے حُبِّ جاہ کا
عشق بحرِ بیکراں ہے، عشق ہے بحرِ عمیق — کون اندازہ لگا سکتا ہے اسکی تھاہ کا

بیوفائی بھی تو ہے آخر تعلق کی دلیل
پھل ثمرؔ پایا ہے میں نے اُن سے اپنی چاہ کا

(۲)

آئیں نہ آئیں کل بھی وہ وقت کا اعتبار کیا؟ — ہو نہ سکا جو آجتک ہوگا وہ سازگار کیا!
آج ہجومِ غم میں بھی نغمہ سرا ہے زندگی — بڑھتی ہوئی مصیبتیں دینے لگیں قرار کیا؟
اپنوں کا خون ہو روا اپنی غرض کے واسطے — چلتا رہے گا بس یونہی دہر کا کاروبار کیا؟
لطف ہیں تیرے بے حساب پھر بھی میں مطمئن نہیں — حرصِ طلب کے سامنے بخششِ بے شمار کیا؟

دیکھ ثمرؔ نہ آئینہ دھبے ہیں اس میں جا بجا
عکس فگن ہے اس میں بھی یہ دلِ داغدار کیا؟

(۳)

کھُلا جس دم درِ میخانہ رشکِ ماہِ کنعاں کا
نگاہیں جائزہ لینے لگیں زاہد کے ایماں کا

امانت زردیٔ رُخ کی کبھی صحرا کو سونپی تھی
اسی سے رنگ اب تک زرد ہے خاکِ بیاباں کا

یہ رقصِ دُخترِ رز یہ سازِ ساغر نغمۂ مینا
بڑا پُر کیف ہے اے شیخ منظر شامِ رنداں کا

تڑپ بجلی کی، شبنم کی نمی، آئینے کا جوہر
مُرکّب ہے انھیں اجزا سے شاید دل بھی انساں کا

نہ جانے کیوں مسلسل اک خلش محسوس ہوتی ہے
کوئی ٹکڑا ابھی تک رہ گیا کیا دل میں پیکاں کا

ارادہ رکھتا ہوں اے شیخ توبہ کا نہ جلدی کر
گذر جانے دے پھر اک بار یہ موسم بہاراں کا

قدِ برجستۂ معشوق پیشِ آئینہ دیکھو
کوئی مصرعہ ہے گویا حضرت ناسخ کے دیواں کا

بہر عنواں لقب پایا نیا فصلِ بہاراں نے
کبھی حُسنِ گلستاں کا کبھی چاکِ گریباں کا

نشانِ پائے وحشت کو لگا کر اپنی آنکھوں سے
اَنَا الصَّحرا پکار اُٹھا ہر اک ذرّہ بیاباں کا

تگ و دو کی شبابِ رفتہ نے ہر چند دنیا میں
نہ آیا ہاتھ میں دامن مگر عمرِ گریزاں کا

تمرؔ کا جسم لاغر۔ زرد رُخ۔ بیتاب دل کیا ہے
یہ اک ادنیٰ کرشمہ ہے کسی کی چشمِ فتاں کا

(۴)

جُنبشِ چشم نے اندازِ کرم چھوڑ دیا!
کیا ہوا! حوصلۂ مشقِ ستم چھوڑ دیا!

ایسی کچھ پڑ گئی ہم پر کہ خدا یاد آیا
تنگ کچھ ایسے ہوئے عشقِ صنم چھوڑ دیا

غنچۂ حسرتِ دل نے کوئی دیکھی نہ بہار
باغباں نے اسے نادیدۂ غم چھوڑ دیا

دیکھ کر برہمیٔ طبع تری زلفوں میں
پنجۂ شانۂ مشاطہ نے خم چھوڑ دیا

بدگماں بزم میں اُن کی نہ ہوئے جبکہ رقیب
ہم نے بھی فتنۂ تحریرِ قلم چھوڑ دیا

اللہ اللہ ترا حُسنِ فریبِ جلوہ
شیخ نے دین، برہمن نے دھرم چھوڑ دیا

آشنا جو تھے، پسِ مرگ انھوں نے بھی تمؔر
ساتھ آکر مرے چالیس قدم چھوڑ دیا

(۵)

کیا حال لکھوں میں رُخ و گیسوئے یار کا
دامن ملا ہوا ہے حلب سے تتار کا

سینے سے اپنے دشت نے بڑھ کر لگا لیا
یہ تھا وقار میرے گریباں کے تار کا

اربابِ حوصلہ رہِ الفت میں مر گئے
کس سے اٹھا ہے بوجھ ترے انتظار کا

ضبطِ غمِ قفس کی ہے توہین ہم نشیں
ہم قیدیوں میں ذکر ہے بیجا بہار کا

مجھ سے نہ پوچھو کیا ہے زمانے کا حالِ زار
مارا ہوا ہوں میں بھی غمِ روزگار کا

برتی مغائرت بھی تو غیروں کے سامنے
شکوہ ہے مجھ کو اس ستمِ ناگوار کا

جس حال میں بھی ہوں مجھے پروا نہیں تمؔر
دل مطمئین ہے شکر ہے پروردگار کا

(۶)

غالباً آپ نے اسکو بھی مرا دل سمجھا
ورنہ کیوں آئینے کو مدِّ مقابل سمجھا

درِ بتخانہ ۔ درِ کعبہ ۔ درِ خانۂ یار
کس نے کس نے مجھے توہین کے قابل سمجھا

مسلکِ عشق میں تھی دشت نوردی بے سود
بعد مدت کے میں رسم و رہِ منزل سمجھا
اور دو ہاتھ بڑھائے گئی طوفاں کی طرف
مجھکو ہر موج نے بیگانۂ ساحل سمجھا
پھر تمؔر حسن نے میرے دلِ آشفتہ کو
التفاتِ نگہہ ناز کے قابل سمجھا

(۷)

سحر کی آہ تھی یا نالۂ شبانہ تھا
تمام عمر یہی شغلِ عاشقانہ تھا
تمہاری بزم میں تھا میں بھی سرفراز کبھی
مرے نصیب میں ایسا بھی اک زمانہ تھا
خیال آتا ہے فصلِ بہار میں اکثر
اسی چمن میں ہمارا بھی آشیانہ تھا
میں سو گیا تری زلفوں کے نرم سائے میں
کھلی جو آنکھ تو بدلا ہوا زمانہ تھا
کسی کو یاد بھی رہتا تو کس طرح کہ تمؔر
مری حیات کا بے ربط سا فسانہ تھا

(۸)

ہجومِ غم میں ہے رنگینیٔ داغِ جگر پیدا
اندھیری رات میں ہے جلوۂ نورِ قمر پیدا
مرا خونِ شہادت رنگ لایا ہے شفق بنکر
کئے ہیں سینۂ گردوں نے کیسے نوحہ گر پیدا
اُسے تاریکیٔ دشتِ جنوں کا غم نہیں ہوتا
گریباں میں جو کر لیتا ہے اندازِ سحر پیدا
نہیں کچھ ہم کو چشمِ التفات آمادہ کی حاجت
ہماری بیکسی کر لیتی ہے خود دل میں گھر پیدا
نگاہِ شوق، اندازِ نظر، حسرت فزا آنکھیں
محبّت نے کئے ہیں کیسے کیسے نامہ بر پیدا

اک ایسی بات واعظ نے سرِ میخانہ فرمائی	کہ خود پینے کی خواہش ہو گئی بارِ دگر پیدا
مچا دیتا ہے جو ہنگامۂ غم دل کی دنیا میں
ثمرؔ مشکل سے ہوتا ہے وہ اندازِ نظر پیدا

(۹)

وعدۂ وصل تو وفا نہ ہوا	بڑھ گئی بات اک فسانہ ہُوا
میری بد بختئ وجود کہ میں	ہائے بندہ ہوا خدا نہ ہُوا
اس کا جینا ہے موت سے بدتر	جس کو مرنے کا حوصلہ نہ ہُوا
غیر پہ اعتماد کیا کرتا	جبکہ اپنوں کا آسرا نہ ہُوا
شیخ جو چاہیں کہہ لیں مسجد میں	کیا بتاؤں کہ میکدہ نہ ہُوا
ان کا وعدہ درست ہے لیکن
میں ثمرؔ کل ہُوا ہُوا نہ ہُوا

(۱۰)

طوفانِ غم کا دجلۂ دل میں ورود تھا	بازارِ شوق نوحہ گرِ ہست و بود تھا
دل میں جہاں پہ نقشِ سویدائے دود تھا	کچھ روز پہلے آہ کا اس جا وجود تھا
یوں موجِ بوئے زخمِ جگر پھیلتی گئی	تا بزمِ ناز سلسلۂ بے نمود تھا
گذری شبِ وصال مگر اس طرح کہ میں	پابندِ اتباعِ رسوم و قیود تھا
حیرت ہے مجھکو شکوۂ اربابِ دہر پہ	چشمِ فلک کا رنگ ازل سے کبود تھا

ہم زعمِ اقتدار کو کیا آزماتے خاک
پیشِ نظر نتیجۂ قومِ ثمود تھا

مرنا پڑا بصیرتِ خاطر کے واسطے
سرمایہ معرفت کا بہ قدرِ شہود تھا

دل کو ڈبو دیا ہوسِ ذوقِ دید نے
میرا زیاں بھی از رہِ تحصیلِ سود تھا

ہمدم بنا سکے نہ ہم ایسے نصیب کو
تا عمر جسکو حیلۂ بست و کشود تھا

کوئی بھی چین سے نہ تھا دنیا میں اے ثمرؔ
دیکھا جسے اُسے غمِ بود و نبود تھا

(۱۱)

غلط ہے یہ کہ کسی فتنہ گر نے لوٹ لیا
ہمیں ہمارے فریبِ نظر نے لوٹ لیا

وجودِ ذات کی بے پردگی ارے توبہ!
بشر کو خود ہی فروغِ بشر نے لوٹ لیا

خیال اسیر ہیں الفاظ کے لبادوں میں
قلم کو حسنِ متاعِ ہنر نے لوٹ لیا

رہِ وفا میں نہ رہزن ملا کوئی جو مجھے
تو مجھ سے جل کے مرے راہبر نے لوٹ لیا

دعا کی عصمتِ بیچارگی کو آخرکار
اُتر کے بامِ فلک سے اثر نے لوٹ لیا

سحر نے سنگِ ملامت سے کھائی ہے ٹھوکر
کہ لطفِ وصل شبِ معتبر نے لوٹ لیا

ثمرؔ غضب ہے کہ سرمایۂ غرورِ انا
جھکا کے مری جبین سنگِ در نے لوٹ لیا

(۱۲)

غلط ہے گر کہا جائے ہجومِ یاس نے مارا
جہانِ شوق میں مجھکو دلِ حساس نے مارا

اسیرِ حلقۂ پیماں نہ ہوتا میں تو اچھا تھا
بندھی تھی جو ہوا پر بس مجھے اُس آس نے مارا

طفیلِ عشق صحرا میں بھٹکنا ہی پڑا مجھکو
مجھے تو اعتبارِ حضرتِ الیاسؔ نے مارا

دوراہے پر عقیدتمندیوں کے ابن آدم کو
کبھی وہموں نے مارا اور کبھی وسواس نے مارا

وہ پھینکا پانسہ اُس نے قصۂ حورانِ جنّت کا
وہ دیکھ اہلِ ہوس کو شیخ کی بکواس نے مارا

مگر یہ غم ہے مجھکو میرا دشمن مجھ میں پنہاں تھا
مرے نفسِ حسیں کو فطرتِ خنّاس نے مارا

(۱۳)

حیف تنہائی احساس یہ عالم ہو کا
مجھ سے بڑھ کر نہ کوئی پیار کا ہوگا بھوکا

تیری زلفوں کا تصوّر جسے ہم کہتے ہیں
ایک ویرانہ بسایا ہوا ہے خوشبو کا

گندگی پھیل گئی فکر کے کاشانوں میں
منہ اُٹھا کر طرف چرخ یہ کس نے تھوکا

خود کو سرداب تخیّل میں چھپا لو لوگو!
صرصرِ وقت ہے چلتا ہوا جھونکا لو کا

وقت کی چلتی مشینوں نے اسے پیس دیا
اک ذرا کارگہِ زیست میں جو بھی چوکا

دیکھ کر گلشنِ جذبات کو ہوتا ہے گماں
رنگ کے شہر میں بازار لگا ہے بو کا

رقصِ الفاظ ہے پھر فکر کے آنگن میں مگر
گھیرا تیار کیا جانے لگا جادو کا

(۱۴)

جب تک جمالِ یار سے میں آشنا نہ تھا
دل میں تھا درد۔ درد میں لیکن مزا نہ تھا

سمجھے ہو التفات کے قابل رقیب کو — کیا اور کوئی شہر میں تمکو ملا نہ تھا
بادہ کشی کا اذن دیا خانقاہ میں — سچ پوچھئے تو شیخ سے صوفی بُرا نہ تھا
صحرا میں یہ خیال ستاتا رہا مجھے — ہنگامۂ وجود کہیں تھا بھی یا نہ تھا
کیوں مائل شکایتِ اغیار اب ہوئے — تم سے دغا کریں گے یہ میں نے کہا نہ تھا؟
آئی نہ کام کا وشِ تنہائی تمام — مجبور تھا کہ جسم سے سایہ جدا نہ تھا
تڑپا تھا رات لذتِ آزار کے لئے — دل ورنہ میرا ننگِ جنونِ وفا نہ تھا
سنتے ہیں شیخ اس پہ بھی آمادہ ہو گئے — وہ جرم جو کسی نے جہاں میں کیا نہ تھا
جب تھے قفس میں ہم تو بہاروں کے رقص تھے — آئے چمن میں جب تو وجودِ صبا نہ تھا

کچھ بھی سہی رقیب سے ہر حال میں تمرؔ
اچھا اگر نہیں تھا تو ہرگز بُرا نہ تھا

'ب'

(۱۵)

تھی مدّتوں جو محرمِ کیتم سبو شراب — بے پردہ ہو گئی وہی پیمانہ جو شراب
ہے آب آب رندِ بلاکش کے سامنے — برداشت کر سکی نہ غمِ آبروِ شراب
یہ بھی امامِ مسجدِ جامع تھے شہر میں — واعظ جو پی رہے ہیں ترے روبروِ شراب
شورش بڑھی جو لشکرِ غم کی بوقتِ شام — بن کر حریف آ گئی خود دو بدو شراب
پہلے تھی بادہ خوار کو صہبا کی جستجو — کرتی ہے بادہ خوار کی اب جستجو شراب

سورج کی طرح گرم ہے یہ شعلہ خو شراب　　اس کے مزاج میں بھی حرارت بلا کی ہے

دیکھے سے اُس کے مست ہوا جاتا ہوں ثمرؔ
میرے لئے ہے دلبرِ آئینہ رو شراب

(۱۶)

ملے تھے حضرتِ ناصح تمہارے گھر کے قریب　　نہ جانے کون سا تھا کام انھیں سحر کے قریب

جو ایک سجدہ بھٹکتا تھا سنگ در کے قریب　　وہی رسوم و مذاہب کی ابتدا ٹھہرا

فلک نے لوٹ لیا کوچۂ اثر کے قریب　　وہ کاروانِ دُعا تھا جسے بآسانی

کسی نے مجھکو پکارا تو تھا سحر کے قریب　　تمہیں تھے یا کوئی تم سا تھا یہ نہیں معلوم

اُسی پہ سب کی نظر تھی خدا ہی خیر کرے
اک آدمی جو تھا بیٹھا ہوا ثمرؔ کے قریب

(۱۷)

کب تک یونہی بدلتے رہیں گے زباں جناب　　چونکہ، چنانچہ، یہ چنیں اور چناں جناب

مجھ کو چلے ہیں چھوڑ کے کہئے ! کہاں جناب ؟　　تنہائی آپ کو بھی نہیں راس آئے گی

سگ کھائے یا کہ کھائے ہُما استخواں جناب　　ہم تو بدن کو چھوڑ کے بے فکر ہو گئے

ملتا ہے کس کو اور کہاں آستاں جناب ؟　　بدعت کی بات چھوڑئیے سنئے جنابِ شیخ !

لکھنے کا کام اُن سے ثمرؔ آپ لیں نہ آج
زلفوں سے کل جو کھیلتی تھیں انگلیاں جناب

(۱۸)

بڑھ گیا جوشِ جنوں فصلِ بہاراں کے قریب — ایک ہنگامہ سا ہے تو چمنستاں کے قریب
چھیڑ اچھی نہیں موباف سے اے پیکرِ حسن — کفر ہو پہنچے نہ کہیں سرحدِ ایماں کے قریب
ہم نہیں جانتے یہ کس کا کرم ہے لیکن — اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
حوصلے پست ہوئے وصل کا ارماں نہ رہا — جمع تھے اہلِ ہوس کوچۂ جاناں کے قریب

آج کیا بات ہے کیوں بادِ صبا مجھکو تمؔ
ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے پہونچی درِ زنداں کے قریب

(۱۹)

آیا جو غیب سے فلکِ پیر کا جواب — تقدیر بن گئی غمِ تدبیر کا جواب
سرگوشیاں ہیں آج بھی لہروں کے درمیاں — رانجھا نے کیا دیا ہے بھلا ہیر کا جواب
کچھ حسرتوں کے خون سے دل کا محل بنا — ممکن نہیں ہے اس فنِ تعمیر کا جواب
بنتا نہیں ہے، فکرِ مصور تباہ ہے — تیرے شبابِ رفتہ کی تصویر کا جواب
آئے تو میرے ہاتھ میں پتھر کا کوئی جام — دوں گا سوالِ واعظِ بے پیر کا جواب
رخسار پر نگاہ کی نظریں بدل گئیں — پھولوں کی مانگ کی تھی ملا تیر کا جواب

فضلِ خدا سے میرا ہر اک کام بن گیا
ممکن نہیں تمؔ مری تقدیر کا جواب

'پ'

(۲۰)

اپنی خلوت سے ہٹا کر مجھکو پچھتائیں گے آپ
جانتا ہوں شب کی تنہائی سے گھبرائیں گے آپ

مجھکو اپنے جذبِ الفت سے بڑی اُمید ہے
بن بلائے خود بخود اک دن چلے آئیں گے آپ

آپ کی بیداد کے ملتے ہیں جس میں تذکرے
سُن کے اُس افسانۂ غم کو تڑپ جائیں گے آپ

خاک میں مل جائے گی اُمیدِ دیدارِ جمال
کیا خبر تھی سامنے آکر بھی شرمائیں گے آپ

میں نے کب جانا تھا دھوکہ آپ کا ہے انتظار
عمر بھر آنے کی اپنے راہ دکھلائیں گے آپ

اک ضروری گفتگو ہے اک ضروری کام ہے
میرے گھر تک اک ذرا تکلیف فرمائیں گے آپ

ایک دن آگاہ رہئے گا تمؔ ہونا ہے یہ
بوئے گل کی طرح محفل سے نکل جائیں گے آپ

(۲۱)

آپ سے ہو گیا ہے کیا کروں پیار آپ سے آپ
آنکھوں میں کر گیا گھر روئے نگار آپ سے آپ

اب مرے جیب و گریباں کا خدا حافظ ہے
پڑ گئی ہے مرے پیچھے یہ بہار آپ سے آپ

بیوفائی کا عبث اشکوں کو الزام نہ دو
جب نکلتا ہے مرے دل کا غبار آپ سے آپ

اک ذرا سینے کو گلزار بنانا ہوگا
سیر کو آئے گا وہ جانِ بہار آپ سے آپ

کل وہ اک شخص سے کہتے تھے یہی تو ہیں تمؔ
مِل چکے ہیں سرِ محفل کئی بار آپ سے آپ

(۲۲)

وہ کر رہے ہیں امن کا پرچار راس وچپ
بکھرے پڑے ہیں آج جو اخبار راس وچپ

دریائے انقلاب کو روکے ہوئے ہے وہ
حائل جو ہے سماج کی دیوار راس وچپ

ہم خوب جانتے ہیں وہ کیسے ہیں روزہ دار
مسجد میں کر رہے ہیں جو افطار راس وچپ

جھٹلائیں کس کو اور کریں کس کا اعتبار
کتنی روایتوں کے ہیں انبار راس وچپ

ہر جا صلیبِ ضبط محبّت کی ہے فروخت
پھیلا ہے کیا یہ پیڈ کا بازار راس وچپ

کس خوش نصیب کے ہے یہ سواگت کا اہتمام
زلفوں نے ڈال رکھے ہیں دو ہار راس وچپ

وہ کہہ رہے تھے مجھ سے تمنّؔ بصد خلوص
دیکھو نہ ہم کو کر کے کبھی پیار راس وچپ

(۲۳)

آجکل رہتے ہو تم کس لئے بولو چپ چاپ
دل کی آواز کو ہونٹوں پہ نہ تولو چپ چاپ

چاہتا ہوں جو کبھی عرضِ تمنا بھی کروں
تم یہ کہتے ہو "زباں یوں نہیں کھولو" چپ چاپ!

کانوں کان اہلِ ہوس کو نہ خبر ہونے پائے
گوہرِ اشک کو پلکوں میں پرو لو، چپ چاپ

رات کا وقت ہے بجلی بھی محلّے میں نہیں
ایسے سنّاٹے میں گھر میرے بھی ہو لو چپ چاپ

جو تمہیں قتل کا ملزم سرِ محفل ٹھہرائیں
اپنے دامن سے انھیں دھبّوں کو دھو لو چپ چاپ

تم مرے پاس ہو پھر بھی ہے تکلّم کا حجاب
شربتِ وصل میں سم یوں تو نہ گھولو چپ چاپ

فردِ واحد بھی مخالف نہ تمنّؔ رہ جائے
خود کو ماحول میں اس طرح سمو لو چپ چاپ

(۲۴)

گرمی میں رہی آگ کا کوڑا ہے کڑی دھوپ
بن جاتی ہے جاڑوں میں جو بھولوں کی چھڑی دھوپ

پچھتاتی رہی اپنی ہی تنہائی کے اوپر
بے یار تھی بیاکھ کی آنگن میں پڑی دھوپ

بے خوف لڑا قیس بھی عریاں بدنی پر
سنتے ہیں کہ جب دشت میں خود اس سے لڑی دھوپ

جو انکی طرف جاتی ہے اس راہ سے کہنا
ہم آئیں تو کس طرح کہ ہے آج بڑی دھوپ

غش کھا کے گرا خاک پر انسان کا سایہ
جب ہو سکی برداشت نہ سورج کی کڑی دھوپ

اک سلسلۂ قید ہے اب لا متناہی
جنجال میں کرنوں کے کہاں سے یہ پڑی دھوپ

گرمیٔ قیامت سے ہمیں صبر ہی بچائیں
ہوتی نہیں برداشت نمّر چار گھڑی دھوپ

"ت"

(۲۵)

جب چھیڑتا ہے کوئی کسی گلبدن کی بات
یاد آتی ہے مجھے بھی فریبِ چمن کی بات

پروانہ اور شمع جلے دونوں ساتھ ساتھ
باہر نہ انجمن سے گئی انجمن کی بات

مدّت ہوئی کہ سنّتِ منصور مر چکی
اک داستانِ کہنہ ہے دار و رسن کی بات

وہ جس کا تار تار بہاروں میں لُٹ گیا
کرتے ہیں لوگ آج بھی اس پیرہن کی بات

ذکرِ بہارِ لالۂ و گل کس طرح کروں
ڈرتا ہوں پھوٹ جائے نہ اُس گلبدن کی بات

صد فکر پر وہ ذاریٔ فصلِ بہار تک
مشہور ہو چکی تھی فریبِ چمن کی بات

ضبطِ غمِ وفا ہے کہ اک سوزِ ناگوار کہتا ہوں سو طرح سے میں اک بانکپن کی بات
مُہرِ سکوت ٹوٹی رقیبوں کے ذکر پہ طنزِ لطیف تمؔ تھی کسی کم سخن کی بات
گذری ہوئی حیات کا کیا تذکرہ تمؔ
افسانۂ شباب ہے عہدِ کہن کی بات

(۲۶)

چھٹتی نہیں تا مرگ سمجھ لو کسی صورت جس شخص کو جس بات کی پڑ جاتی ہے عادت
ہر چند رہی جستجوئے وصل بہر طور نکلی نہ کوئی تم سے ملاقات کی صورت
یہ حسن کی دنیا ہے کہ دھوکے کا ہے بازار یہ کذبِ مسلسل ہے کہ اعلانِ محبّت
جس میں تمہیں دینا ہے ثبوت اپنی وفا کا اُس فلم کی بولو تو سہی کب ہے مہورت
جو بات ہے وہ منھ پہ تمؔ صاف کہے گا
آئینہ تو آئینہ ہے کیا جانے مروّت

(۲۷)

اصنام نے گذاری ہے اسمیں ہزار رات دل میرا بھی ہے عہدِ گذشتہ کا سومنات
ممکن نہیں ہے جلوۂ عرفانِ حسنِ ذات کھینچے ہوئے قنات کھڑے ہیں تعینّات
دنیا میں آکے چند دنوں رہ کے چل دئے ہے مختصر ترین مرا قصّۂ حیات
میداں بہت وسیع ہے ندرت کے واسطے مہمل نگاریوں سے بناؤ نہ اپنی بات
ساقی ہوا خلاف تو ساغر بھی چھن گیا بس اک نگاہ کے ہیں یہ سارے تغیّرات

میں تم سے پوچھتا ہوں خدا کے لئے بتاؤ
وہ عشق باز کیا کرے جو کھا گیا ہو مات

لب تشنگانِ غم کو نہ سیراب کر سکی
پیاسی ہے میہمانوں کی ان آنکھوں کی فرات

واضح ہوئی نہ مجھ پہ حقیقت جمال کی
دیتے رہے فریب بدلتے ہوئے صفات

عیاّر ہم سے بڑھ کے قمؔر کب رقیب ہیں
وہ ڈال ڈال اگر ہیں تو ہم بھی ہیں پات پات

(۲۸)

جانبِ دشت چلا میں جو غمِ یار سمیت
پاؤں پہ گر پڑا، خود گھر مرا، دیوار سمیت

لوگ پھر آنے لگے بار گہہِ گیسو میں
جیب و دامان و گریباں کے کئی تار سمیت

دل رجوع اس کی طرف ہو نہیں سکتا ہرگز
حُسن کا کیجیے تصوّر اگر انکار سمیت

خلشِ غم کی وہ اُلجھن ہے کہ سب چاہتے ہیں
تیر آجائے مری سمت ستمگار سمیت

کیا کوئی حادثہ پیش آیا ہے کیا بات ہے آج
لوگ کیوں آئے ہیں گھر پہ مرے اخبار سمیت

ان کے عشرت کدۂ ناز کی دہلیز پہ ہیں
جمع اربابِ ہوس رنج کے انبار سمیت

سنتے ہیں بزمِ سخن میں ہے قمؔر کی آمد
حُسنِ معنیٰ کے نکیلے کئی ہتھیار سمیت

(۲۹)

آہو نے ان کی آنکھ کی اچھی چلائی بات
میں بول اُٹھا رُک نہ سکی منھ پہ آئی بات

جنگل کی آگ بن کے یہ پھیلی ہے چار سو
پہونچی ہے اہلِ دل تک اسی کی لگائی بات

اب اس کا فیصلہ تو کریں گے تماش بین — تم نے بڑھائی بات کہ میں نے بڑھائی بات

پھر اُس کے تذکرے سے کوئی فائدہ نہیں — جب صلح کر سکی نہ کسی سے صفائی بات

دراصل اُنکی ہے وہی روئداد گمرہی — سنتے ہیں جس کو لوگ سمجھ کر پرائی بات

اک حسنِ بے نیاز کی کل بزمِ شوق میں — بالاتفاق اہلِ وفا نے چلائی بات

کیا اعتبار قاصدِ بے اعتبار کا — لہجہ بدل کے دیکھو پھر اس نے بنائی بات

تنگ آکے بارِ غم سے سبکدوش ہو گئے
احباب کی تمرؔ نے بہت کچھ اٹھائی بات

(۳۰)

سنگدل معشوق کا رکھتے ہیں جو جگر بہت — اُن سے کہدو کوہ کے دامن میں ہیں پتھر بہت

بے گھروں کو ہو نوید اس دورِ پُر آشوب میں — وادیوں کی گود میں سونے پڑے ہیں گھر بہت

ریگ زارِ معنوی میں اہلِ بنیش کے لئے — سنگریزے ہیں بہت کم اور ہیں گوہر بہت

عشرتِ موہوم کی اُمید میں جینا پڑا — زندگی اس دور میں انساں کی ہے دوبھر بہت

آگیا سیلاب کی زد میں پرستانِ رقیب — غالباً رو دی ہے شب کو میری چشمِ تر بہت

صرف چہرے پر نہیں موقوف شانِ دلبری — ورنہ ملنے کو ملے ہیں آپ سے بہتر بہت

غیر ممکن ہے کہ نخلِ آرزو ہو بارور
جب تمرؔ کرتے رہیں گے رات دن کڑ کڑ بہت

"ٹ"

(۳۱)

غم طلب ہوں پڑ گئی ہے غم کی چاٹ — آدمی شائد کہ میں بھی ہوں سپاٹ

ہے یہی پودا چمن در آستیں — تیغ زن نخلِ تمنّا کو نہ کاٹ

ڈال مٹّی قصۂ پارینہ پر — اس خلیج درمیاں کو اب تو پاٹ

ہے رقیبِ روسیہ یوں تیرے ساتھ — جوڑ دے مخمل میں جیسے کوئی ٹاٹ

بے مزہ لکھی تبسّم تم نے غزل
جی میں آتا ہے کہ دوں مصرعوں کو کاٹ

(۳۲)

دل تو نہ سہہ سکا نگہِ فتنہ گر کی چوٹ — لیکن ہے یادگار ابھی تک جگر کی چوٹ

اے آرزو نہ کہہ انھیں آنے میں دیر ہے — لگتی ہے دل پہ تیر کی صورت خبر کی چوٹ

شائد ہماری ہمّت دل کا ہے امتحاں — تعمیرِ آشیاں پہ ہے برق و شرر کی چوٹ

پہلو میں دل نہ صورتِ بسمل تڑپ کہ اب — پیدا اِدھر کی چوٹ سے ہو گی اُدھر کی چوٹ

اک طنز ہے کشاکشِ عشق و جہاں کا — آہ و فغاں پہ نالۂ غیر از اثر کی چوٹ

مجھکو قفس عزیز تھا اب اسکو کیا کروں — تھی ناگوار طعنہ زنِ بال و پر کی چوٹ

ہم نے دل و دماغ پہ کھائی تبسّم تو کیا
بزمِ سخن میں سنگِ متاعِ ہنر کی چوٹ

(۳۳)

اسپِ دوراں کی چال ہے سرپٹ
تار کی طرح کھٹ کھٹا کھٹ کھٹ

دل کی دل میں رہی مقدّر سے
ہم الٹتے ہی رہ گئے گھونگھٹ

پھر سماعت ہے اضطرار بگوش
پتّا پھر کھڑکا پھر ہوئی آہٹ

شہرِ حسن و جمال ہے پیاسا
آج آباد پھر ہوا پنگھٹ

صبح کی راہ روکے بیٹھی ہے
شامِ ہجراں کی بیدل اُکتاہٹ

درمیاں میں یہ کون آدھمکا
ہوگیا سب معاملہ چوپٹ

شیخ سے میکدے میں کل شب کو
ایک ساغر پہ ہوگئی جھنجھٹ

میری نظروں میں عزّتِ گلشن
ہے کوئی بات جو گئی ہے گھٹ

اے ثمر اس نئی غزل کا رُخ
ہم کو اب تک نہیں پڑا ہے پٹ

'ٹ'

(۳۴)

تم یہ سمجھے ہو کہ پیدا ہوا انسان عبث
جسم بیکار ہے دل ہیچ ہے اور جان عبث

شرحِ غم آہ کے اک نقطے سے ہو جاتی ہے
قائم الفت کا کیا لوگوں نے عنوان عبث

میں سرِ خلوتِ معشوق ہوں اور مرے رقیب
پسِ دَر در سے لگائے ہوئے ہیں کان عبث

لوگ کہتے ہیں خدا جانے کہاں تک سچ ہے
آپ کا وعدہ غلط آپ کا پیمان عبث

کس کو فرصت ہے غمِ دہر سے دیکھے گا کون
تم ثمرؔ لکھتے ہو اس دور میں دیوان عبث

(۳۵)

ہو اگر جذبِ محبت بے لوث | کیجئے قوم کی خدمت بے لوث
تم سے غیروں کی غرض اٹکی ہے | نہیں ہوتی یہ مروّت بے لوث
حیف اتنا بھی نہیں تم سمجھے | کوئی کرتا ہے رعایت بے لوث؟
قابلِ قدر بہر صورت ہے | ہو کسی سے جو عداوت بے لوث
کوئی واعظ کو بنا دیتا کاش | مار کر سنگِ ملامت، بے لوث
بیوفائی کا نہ شکوہ ہوتا | ہوتی انساں کی جو طینت بے لوث

نہ رہے فکر رقیبوں کی ثمرؔ
واقعی ہو جو محبّت بے لوث

'ج'

(۳۶)

دِل میں ہے درد، درد میں لذّت سوا ہے آج | پھر ذوقِ صد گزارش یک مدعا ہے آج
ناواقفِ رسوم فراق آجتک تھا دل | پہلی دفعہ اسیرِ شبِ غم ہوا ہے آج
زیرِ نقاب آہی گئے میرے سامنے | ایجاد آپ نے ستم نو کیا ہے آج
یوں تو نہ جانے کتنے ہی صدمے اُٹھائے ہیں | لیکن غمِ فراق بہت ہی کھلا ہے آج

لاتا ہوں جب بھی حرفِ شکایت لبوں تک میں کہتے ہیں لوگ آپ کو یہ کیا ہوا ہے آج
جس کی گرج سے ریت کے دل دہلے جاتے تھے ساحل کے پاؤں پر وہ سمندر پڑا ہے آج

کل رات میکدے میں جو تھا پیرِ میکدہ
ہم نے بھی تمؔ سنا ہے وہی پارسا ہے آج

(۳۷)

شہرِ فطرت میں چلا آتا ہے اب تک یہ رواج جب ہوا صدمہ کوئی دل پہ بڑھا خود اختلاج
آدمی کوئی نظر انداز ہو سکتا نہیں اُسکی تنہا ذات کا محتاج ہے پورا سماج
ہو گئی بدنظمیوں کی حد ہمارے دور میں آدمی کا خون سستا اور مہنگا ہے اناج
آپ کر سکتے ہوں گر تو شوق سے پھر کیجیے زخمِ دل، زخمِ جگر، دردِ محبّت کا علاج
رحم کھا کر یا بہ مجبوری ہوئے وہ ملتفت موت کا باعث نہ بن جائے کہیں یہ ابتہاج
یہ تو ممکن ہے کہ شکلِ جور ہو جدّت پذیر ظلم کا دنیا سے مٹ سکتا نہیں لیکن رواج

وہ زمیں پہ پاؤں رکھتے ہی نہیں سنئے تمؔ
آسماں پر ہے دماغ اُن کا نہیں ملتا مزاج

'ح'

(۳۸)

ہے لچر تقریرِ واعظ اور ہے تحریر ہیچ جیسے سطحِ آب پہ بالو کی ہے تعمیر ہیچ
جان اپنی بیچ کر چلتے ہیں اربابِ وفا راہِ الفت میں ہے خوفِ ناوک و شمشیر ہیچ

ہمّت مردانہ رکھتا ہوں بصد عزمِ جواں — ظلم کو تیرے سمجھتا ہوں میں چرخِ پیر ہیچ
یہ گرفتارانِ عشقِ یار کہتے تھے کہ ہے — حلقۂ گیسو کے آگے حلقۂ زنجیر ہیچ

تجربہ اپنا ثمؔر یہ ہے دیارِ شوق میں
عمر بھر تقدیر کے آگے رہی تدبیر ہیچ

(۳۹)

سوچنے کا وقت ہے اب بھی دلِ ناکام سوچ — پتھروں سے کھیلنے کا آخری انجام سوچ
ماہئِ بے آب دل کو دفن کر کے ریت میں — کیا ملا ہے مالکانِ دشت سے انعام سوچ
گر نہیں تجھکو ہے یہ ہنگاموں کی دنیا پسند — کارخانوں سے الگ رہ کر کے کوئی کام سوچ
کوہکن مزدور پیشہ ۔ تیشہ باز و تیشہ خور — ہوگا کیا انجام شیریں یہ فرازِ بام سوچ
جھٹپٹے وقت آج اندھیرے اک کرن سے لڑ گئے — کل انھیں مسلے گا سورج ۔ چرخِ نیلی فام سوچ
میری وحشت اک معمّہ ہے ابھی تک سنگِ راہ — ہو نہ جائے رازِ اندر رازِ طشت از بام سوچ

دورِ حاضر میں ثمؔر ہوتا نہ گر سینہ سپر
فن کا ہوتا حال کیا اے گردشِ ایام سوچ

"ح"

(۴۰)

پکارتے رہے غمِ شورشِ سگاں کی طرح — حیات بڑھتی رہی آگے کارواں کی طرح
درِ فلک پہ کسی اور نے بھی دی دستک — مرے ندیم مری اجنبی فغاں کی طرح

یہی نہیں کہ رقیبوں سے مجھکو شکوہ ہے
مرے خلاف رہے تم بھی آسماں کی طرح

بہار اپنی طرف ملتفت نہ کر لے کہیں
فریبِ عشوۂ صد رنگِ دلبراں کی طرح

چمن پہ پھر نہ کوئی آفتِ جدید آئے
کبھی کبھی سہی بہار اب کے ہے خزاں کی طرح

خلش رہی یہی تا مرگ عہدِ پیری میں
شباب گذرا مگر عمرِ رائگاں کی طرح

خدا کا شکر کہ تیرا ستم ہے طشت از بام
ترے دیار میں بھی پڑ گئی فغاں کی طرح

وفا کا راز کھُلے گا نہ میرے جیتے جی
چھپائے ہوں ترے غم کو متاعِ جاں کی طرح

یہ کائنات اور اس کائنات کی ہر شے
قمرؔ ازل سے ہے جنبش میں کارواں کی طرح

(۴۱)

راستے کی حالت کے گر ہیں پیچ و خم شارح
ہمّتِ عمل کی ہے تیزئی قدم شارح

جو بھی ہم پہ گذری ہے واردات ہیں اس کے
زرد زرد چہرے اور دیدہ ہائے نم شارح

غیر کو نہیں ہوتا نکتۂ ستم محسوس
اپنے غم کا ہوتا ہے صاحبِ الم شارح

کوئی مصحفِ نغمہ اس جگہ کبھی اُترا ہے
وادیوں کے سنّاٹے کا ہے زیر و بم شارح

دور وہ بھی آئے گا جب قمرؔ زمانے میں
حرفِ آہ کے ہوں گے شیخِ محترم شارح

(۴۲)

نہ بھاگیں آپ مرے سایہ سے پری کی طرح
بشر ہوں میں بھی خدا شاہد آپ ہی کی طرح

سلوک ہم سے کر رہا ہے اجنبی کی طرح — خدا کے واسطے جینے دو آدمی کی طرح
جو نکتہ چیں مری وحشت کے ہیں وہ کیا جانیں — جنوں رگوں میں ہے پیوست زندگی کی طرح
فریبِ مشغلۂ التفات کو سمجھو — یہ دوستی ہے جو ڈالے گی دشمنی کی طرح
خدا کی شان زمانہ بدل گیا ایسا — ہم اپنے شہر میں پھرتے ہیں اجنبی کی طرح
رقیبِ جلوۂ گُل ہو سکی نہ تا دمِ مرگ — وہ آرزو کہ جو مرجھا گئی کلی کی طرح
تم ایسے دہر میں پابندِ وضع کم ہوں گے — جو دشمنی بھی نبھاتے ہیں دوستی کی طرح
تکلّفات کی دنیا ہے اس کو کیا کہیئے — خلوص ہو گیا نایاب آدمی کی طرح
بنی ہے انجمنِ وحشیانِ صحرا آج — جنوں نے ڈالدی جنگل میں آگہی کی طرح
وہ کم نصیب جگہ میرا گلستاں ہے جہاں — بہار آئی جوانی کی چاندنی کی طرح

تمرؔ کو دیکھ کے کہنا پڑا ہمیں بھی تمرؔ
جنابِ قیس تھے اغلب ہے آپ ہی کی طرح

"خ"

(۴۳)

وہ چہرہ جو ہے مثلِ گُلِ نوبہار سُرخ — ہنگامِ غیظ ہوتا ہے مانندِ نار سُرخ
یہ بھی ہمارے خونِ وفا کا ہے معجزہ — اب تک جو ہے نشانیٔ یومِ بہار سُرخ
ساقی نے میرا خونِ تمنّا ملا دیا — شاید اسی سے ہے یہ مئے خوشگوار سُرخ
روئدادِ ظلم لکھنے کی خاطر بہ شدّ و مد — رکھتا ہوں میں بھی کلکِ حقیقت نگار سُرخ

کیا فائدہ گزارشِ احوال سے ثمؔر
ہوتا ہے ان کا روئے حسیں بار بار سُرخ

'د'

(۴۴)

دل سے تا ابد نا محرمِ انجام ہے شاید
محبّت اک مسلسل ابتدا کا نام ہے شاید
تلاشِ طورِ نو زائیدہ میں بے چین رہتا ہوں
بہت پُر حوصلہ میرا دلِ ناکام ہے شاید
ترا نکھرا ہوا چہرہ ترے بکھرے ہوئے گیسو
وہ ہے صبحِ بنارس یہ اودھ کی شام ہے شاید
جھجھکتا ہوں ابھی میں اپنے مقصد کی گزارش سے
مرے ساغر میں تھوڑی سی مئے گلفام ہے شاید
ثمؔر کے نام پہ اظہارِ حیرت تیری عادت ہے
ثمؔر محفل میں تیری آج بھی گمنام ہے شاید

(۴۵)

ہوا بس یہ نظریں ملانے کے بعد
کہ رونا پڑا مسکرانے کے بعد
میں ہی میں تھا خلوت کدوں میں ہنوز
میں خود کھو گیا ان کے آنے کے بعد
نہیں بھول سکتا میں وہ وقتِ دید
بہت یاد آئے ہو جانے کے بعد
بجھا میرا دل بھی تو کب کیا کہوں
چراغِ محبت جلانے کے بعد
قیامت ہوئی کھل گیا رازِ عشق
زباں پہ ترا نام آنے کے بعد
پیامِ اجل لیکے آئی یہ رات
نہ چھپتا سکے دل لگانے کے بعد

ثمرؔ دیکھ پائے نہ ہم روئے دوست
گئے ہوش آئے نہ جانے کے بعد

(۴۶)

رہینِ نازکی حسنِ التفات ہے شاید
دل اپنا جام کی مانند بے ثبات ہے شاید
جگر کے داغ کو ہم اسلئے چھپائے ہوئے ہیں
یہی تمہاری محبت کی کائنات ہے شاید
سکونِ دل کسی صورت مجھے نہیں ملتا اب
محیطِ غم میں مری کشتیٔ حیات ہے شاید
شریک مجلس شوریٰ فقیہہ و صوفی و شیخ ہیں
بنامِ دیں کہیں رند و تمہاری بات ہے شاید
ثمرؔ نہیں مجھے سیراب کر سکی مری ہستی
یہ بحر زندگیٔ شوق بھی فرات ہے شاید

(۴۷)

وقت پر منچلے ہیں اہلِ خرد
پھر بھی ہم سے بھلے ہیں اہلِ خرد
مدتوں تک جنوں کے سائے میں
جانتا ہوں پلے ہیں اہلِ خرد
سوگواروں میں ان کے نام لکھو
خاک منہ پہ ملے ہیں اہلِ خرد
سنگ باروں کی آمد آمد ہے
کچھ سمجھ کر ٹلے ہیں اہلِ خرد
ریل کی پٹریاں ملا نہ سکے
دل ملانے چلے ہیں اہلِ خرد
رسیوں سے بندھے ہوئے سرِ راہ
یہ ہمارے گلے ہیں اہلِ خرد
یادِ جاناں کی خلوتوں میں ثمرؔ
ہمکو اکثر کھلے ہیں اہلِ خرد

''ڈ''

(۴۸)

ہے اگر معمار کو حسنِ عمارت پر گھمنڈ
جو گڑے ہیں نیووں میں کرتے ہیں وہ پتھر گھمنڈ

برہمی پر ناز فرما کاکلِ شب رنگ ہے
کم ملیں گے جو کریں طبعِ مکدّر پر گھمنڈ

تجربہ کی بات ہے یہ قولِ اربابِ شعور
کرتے ہیں کم ظرف جو ہوتے ہیں وہ اکثر گھمنڈ

کمتری احساس کی منزل میں ہوتی ہے بُری
کرتے ہیں کچھ لوگ ہو کر آپے سے باہر گھمنڈ

ریت کی دیوار ہے یہ زندگی بالو کی بھیت
اس پہ اے نادان انساں تو نہ اتنا کر گھمنڈ

آسماں پر ہو نہ کیسے اہلِ ثروت کا دماغ
جب کہ فرماتے ہیں ان کے خادمانِ در گھمنڈ

ہر سفینے پر تمرؔ اس کی نگاہِ غیظ ہے
بے حقیقت موج کرتی ہے سمندر پر گھمنڈ

(۴۹)

اب تک کبھی پڑی نہیں جیسی پڑی ہے ٹھنڈ
امسال لوگ کہہ یہ رہے ہیں بڑی ہے ٹھنڈ

کمبل سے منھ نکالنے کا حوصلہ نہ کر
ناوک بدست سب کے سروں پر کھڑی ہے ٹھنڈ

افلاس کے حضور میں قسمت کی لیکے آڑ
دہقاں کے خونِ گرم سے اکثر لڑی ہے ٹھنڈ

کیوں کر رہے ہو تذکرۂ گرمیٔ وفا
خنجر کی طرح برف کے دل میں گڑی ہے ٹھنڈ

میں اور جاڑے پالے میں کیا گھومتا تمرؔ
نکلا ہوں گھر سے جب مرے پاؤں پڑی ہے ٹھنڈ

'ذ'

(۵۰)

دیتے ہیں جو وفا کو ترحم کا باج شاذ
ایسوں کو تو معاف کرے گا سماج شاذ

تنہائیوں میں آپ سے رہتا ہوں ہمکلام
ہوتی ہے ہم نفس کی مجھے احتیاج شاذ

بہتر یہ ہے دیارِ حسیناں کو چھوڑ دیں
اس ملک میں وفا کا ہے شاید رواج شاذ

سب سے الگ تھلگ ہوں مری طبع ہے جُدا
ملتا کسی کسی سے ہے میرا مزاج شاذ

اس سے تمام لوگ بخوبی ہیں باخبر
پھولا پھلا زمانے میں ظالم کا راج شاذ

بھوکے جو انبساط کے ہیں وہ چنیں گے خاک
ملتا ہے شہرِ غم میں خوشی کا اناج شاذ

دل لیکے اُن کے سامنے جانا نہ تم ثمرؔ
پتھر کی زد سے بچتا ہے سن لو زجاج شاذ

'ر'

(۵۱)

چشمِ ساقی کا فسوں چلتا ہے پیمانے پر
اور حیرت ہے تجھے میرے بہک جانے پر

سر سے سرکے نہ کہیں زلف ترے شانے پر
فتنۂ حشر ہے تیار مچل جانے پر

کچھ نہ کچھ وحشتِ دل اب بھی ہے شاید باقی
خود پہ ہنستا ہوں کبھی میں کبھی ویرانے پر

آرزوؤں نے تراشے ہیں نئے آئینے
حُسن کچھ اور بڑھا آپ کا شرمانے پر

آشنا ذوقِ تپش سے ہوئی رفتہ رفتہ
شمع کو رشک جو آنے لگا پروانے پر

ایک عالم میں اُڑائے لئے پھرتا ہے مجھے — دل نے پائے ہیں کہاں سے یہ خدا جانے پر
دادِ غم چشمِ ستم سے مجھے ملنا تھی ملی — اب کوئی روئے نہ روئے مرے افسانے پر
یہ اُداسی تو ہے مرہونِ نیازِ غمِ دل — منحصر کچھ نہ چمن پر ہے نہ ویرانے پر
دل میں اک راز چھپائے ہوں مگر کس سے کہوں — نہ تو اپنے پہ بھروسہ ہے نہ بیگانے پر
پھر بھی انسان ہیں ہم کیسے رہیں تیرے قریب — دور ہٹ جاتا ہے پتھر بھی تو ٹھکرانے پر

پھل ہر اک کام کا ملتا ہے ثمر دنیا میں
خیر جی کھول کے ہنس لے کوئی دیوانے پر

(۵۲)

ہجر میں بھی ہوں بیقرار وصل میں بھی ہوں بیقرار — جسکو سکون کہتے ہیں اس کا نہیں کچھ اعتبار
میری کوئی خطا نہیں عشق کے مسئلے میں ہے — یہ بھی اک اتفاق ہے دل پہ رہا نہ اختیار
کشمکشِ حیات ہے وجہ بقائے دردِ دل — بیخودیٔ نیاز ہے ذوقِ جنوں سے مستعار
خوفِ خدا کے ساتھ ساتھ خوف ہے اہلِ دہر کا — شوقِ نظارۂ جمال بن گیا میرے حق میں خار

اپنا رقیب آپ ہوں منزلِ عشق میں ثمر
میری خطا ہے بزم میں جاتا ہوں اُنکی بار بار

(۵۳)

رشک آتا ہے گل کو تری نازک بدنی پر — رکھتا ہے ترا بلبل عارض یمنی پر
حسن آنکھ کے احساس شعوری کا ہے تابع — موقوف نہ گل پر ہے نہ کچھ ناگ پھنی پر

زندہ رہے زندانِ شبِ ہجر میں کیسے؟ — کاٹی ہے حیات آپ نے نیزے کی انی پر
دیدار کی خواہش تجھے رسوا نہ بنا دے — کر غور کبھی فقرۂ ربّ اَرَنی پر
میں دل کو بناتا ہوں ہدف آپ سے ورنہ — حرف آنے کو آسکتا ہے ناوک فگنی پر
کل رات کو اے واعظ ناعاقبت اندیش — ہنستے رہے میخوار تری رائے زنی پر

اُردوئے مُعلّٰی پہ ثمرؔ ہم بھی ہیں نازاں
تھا نازؔ وَلیؔ کو جو زبانِ دکنی پر

(۵۴)

تلاشِ عشق میں ہوتا گیا میں عشق سے دور — تمام کوششیں میری تھیں سعیٔ نامشکور
گھری ہے حدِ قناعت میں احتیاجِ حیات — مرا سکون ہے صد رشکِ قیصر و فغفور
قفس میں جاؤں گا صیاد خود سے میں لیکن — مری حیا کو نہیں ذلتِ چمن منظور
ملے جو قیمتِ لغزیہ پر تو ہے بے سود — وہ حور ہو کہ ہو جنّت کہ ہو شرابِ طہور

مٹا نہ دے کہیں شیرازہ بندیٔ انساں
ثمرؔ یہ گلشنِ دنیا کا خود غرض دستور

(۵۵)

دل بھر آیا منظرِ شہرِ خموشاں دیکھ کر — مجھکو عبرت ہو گئی انجامِ انساں دیکھ کر
ابروئے جاناں کو دیکھا روئے جاناں دیکھ کر — ماہِ نو دیکھا ہے ہم نے آج قرآں دیکھ کر
دل میں رہ رہ کر گذرتے ہیں مرے کیا کیا خیال — آپ کے چہرے پہ گیسوئے پریشاں دیکھ کر

میکدے کی سمت ہم آئے ہیں گھبرائے ہوئے اختلافاتِ رسومِ کفر و ایماں دیکھ کر
وائے نادانی ثمرؔ رکھتا ہوں میں اُمّید جام
ساقیٔ میخانہ کا فیضِ فراواں دیکھ کر

(۵۶)

اک آشیاں چمن میں ہے نافِ چمن سے دور اپنے وطن میں رہ کے بھی میں ہوں وطن سے دور
یارب بھری بہار میں ہو آشیاں کی خیر بجلی کہیں گری تو ہے، جانِ چمن سے دور!
ہر چند دشت میں نہیں آسائشِ حیات اتنا تو ہے کہ ہوں میں غمِ انجمن سے دور
آسودۂ مذاقِ محبّت ہوا انہیں وہ بدنصیب جو ہے ترے بانکپن سے دور
خودداریٔ وجود کی اک داستان ہے وہ لاش جو ہے منّتِ گور و کفن سے دور
برباد کردے رونقِ میخانۂ طرب یہ بات ہم نفس نہیں چرخِ کہن سے دور
میری مثال اس گلِ صحرا کی ہے ثمرؔ
جو پھول آج تک ہے نواحِ چمن سے دور

(۵۷)

کریں گے آپ سروں کا شمار کتنے اور بچے ہیں آج سزاوارِ دار کتنے اور
بگولے تھک گئے ذرّوں کو نیند آنے لگی سنیں گے دشت میں میری پکار کتنے اور
خزاں کے آنے میں کچھ دیر اگر ہوئی تو یہ لوگ نہ جانیں کھائیں فریبِ بہار کتنے اور
فقیہہ شہر سے لفظوں کی بھیک کیوں مانگوں ملیں گے راہ میں سرمایہ دار کتنے اور

اسے بتائیں گے دورِ جدید کے فنکار بنائے جائیں گے تازہ مزار کتنے اور
ہماری طرح ذرا ہم بھی دیکھیں تیرے لئے کریں گے سنگِ ملامت سے پیار کتنے اور
نمودِ سلسلۂ غم اگر سلامت ہے رہِ حیات سے ہوں گے فرار کتنے اور
تمہارے غم سے غمِ روزگار تک دیکھیں مٹائیں گے ہمیں ترتیب وار کتنے اور

شکستِ شانہ کے دکھلائے گا تماشے قمرؔ
سوادِ حلقۂ گیسوئے یار کتنے اور

(۵۸)

یہی بہتر ہے کہ کر موت کی تیاری چھوڑ! شیخ مرنے کے ہیں دن مسندِ میخواری چھوڑ
یاد اللہ کو کر کام یہی آئے گا حشر نزدیک ہے اصنام کی اب یاری چھوڑ
دیکھ پیمان شکنی منزلِ آخر میں ہے یہ روایت جو سکھاتی رہی عیّاری چھوڑ
غمِ ہستی کا تقاضا ہے کہ سنجیدہ بن دل لگی چھوڑ دے معشوق کی دلداری چھوڑ
یہ کنیزِ حرمِ مسلکِ تحریک ہے جب یہی بہتر ہے کہ شہرت کی طلبگاری چھوڑ
دور سے کہنگیٔ رسم کی بو آتی ہے رائے ہم سب کی یہی ہے کہ ستمگاری چھوڑ

مدّتِ چاکریٔ زیست قمرؔ ختم ہوئی
یہ مکانِ بدنی جب کہ ہے سرکاری چھوڑ

(۵۹)

میری سلیقہ مندی بولی پھینک دے اسکو کمرہ جھاڑ
مدّت سے جو پڑا ہوا ہے آبائی یہ کاٹھ کباڑ

جب بھی ارادہ کرتا ہوں میں شہر گیسو تک جانے کا
ہو جاتی ہے کالے کوسوں کی دوری اور راہ پہاڑ

چاہے خلوت خانے کی لذّت میں کمی ہر چند رہے
اس مہنگائی میں نہ خریدے کوئی مسہری اور نواڑ

گلچین و صیاد کی سازش جانے کیا گُل آگے کھلائے
فصل خزاں کے آتے آتے گلشن ہو جائے گا اُجاڑ

رات تواضع میں اس نے بھرماریوں پانوں کی کردی
جیسے ڈلی کتھا ہو گھر کا جیسے گھر کی ہو پنواڑ

جو تجھکو دو روٹی اور ایندھن بھی مہیا کر نہ سکیں
ایسی کتابیں لاحاصل ہیں ایسی کتابوں کو تو پھاڑ

اُن سے ثمرِ اُمیّدِ جلوہ سوکھے پیڑ سے پھل کی چاہ
اُن کے چہرے کی خاطر ہیں رشک و حیا، بیزاری آڑ

'ز'

(۶۰)

بدل نہ دے کہیں فکر و عمل کا یہ انداز
مری نوا ہے رہینِ صدائے شاہِ حجاز
ورق الٹ کے ذرا دیکھ صحفِ ہستی کے
مثالِ شمع ترے دل میں ہو جو سوز و گداز
بقیدِ دولتِ ایماں اگر ہو سرمایہ
تو اس متاع کا ہے شرعِ زندگی میں جواز
ضمیر بیچتے ہیں دام میں نہ آ ان کے
ملا جو کرتے ہیں ہر صبح و شام روغنِ قاز
زالتفات زمانہ زصدقِ قول و یقیں
جو کل حریف تھے ہیں آج ہم آواز

(۶۱)

سن سکتا نہیں کوئی بھی تقدیر کی آواز
تقدیر ہے سازِ غمِ تدبیر کی آواز
میخانے کا در بند ہوا ختم ہوئی رات
ہوتی ہے سحر آئی ہے تکبیر کی آواز
سنتا ہوں سرِ شام سمندر کے کنارے
رانجھا کی کبھی اور کبھی ہیر کی آواز
کل رات گئے خوبیٔ تقدیر سے میری
کچھ کہہ تو رہی تھی فلکِ پیر کی آواز
بڑھ جاتا ہے کچھ اور مرا حوصلۂ عرض
پہلے سے دعا سنتی ہے تاثیر کی آواز
پابندیٔ انساں پہ بہاتی رہی آنسو
تا صبح مرے پاؤں کی زنجیر کی آواز
پڑھتے ہیں تمؔ شعر سرِ بزم کہ یارو
غالبؔ کا یہ لہجہ ہے کہ ہے میرؔ کی آواز

(۶۲)

یہ رنگ روپ یہ صورت یہ عشوہ یہ انداز　　نگاہِ عاشقِ سیماب خو کا ہے اعجاز

تو میرے خوابِ جوانی کی ہے حسیں تعبیر　　تو میرے سینۂ غم آشنا کا ہے اک راز

جو آئے لیکے سرِ دست دل کا نذرانہ　　مری طرح نہ ملا تجھ کو کوئی شاہد باز

بلا کی برق ہے، تیرِ ستم ہے، قاتل ہے　　تری نگاہ، تبسم ترا، تری آواز

خدا ہی جانے ترے دل میں کیا ہے دشمنِ جاں　　وفا کے نام پہ دیتے ہیں دھوکہ دھوکے باز

بشوق آ کہ کشادہ ہے آرزو کی گود　　درِ حریمِ تمنا ہے ایک عمر سے باز

قمر ہے شاعرِ مفلس غریبِ شہرِ خودی
اسیرِ پنجۂ رنجِ فراق و ننگِ نیاز

(۶۳)

درمیانِ مردماں سب رہیگا امتیاز　　باز اپنے ڈھنگ سے کب رہیگا امتیاز

عشق والے مر گئے حرص والے رہ گئے　　اس طرح کا تا ابد اب رہیگا امتیاز

دہر کا غم دوستو جب کہ پرکھا جائیگا　　زندگی و موت میں تب رہیگا امتیاز

مٹ گیا گر تفرقہ درمیانِ خیر و شر　　نیک و بد میں سوچئے کب رہیگا امتیاز

جانتا ہوں میں قمر بس ہوس کے نام پہ
بزمِ دل میں ایک دن دب رہیگا امتیاز

(۶۴)

اپنے وجود ہی کا جو عارف نہیں ہنوز
اسرار کائنات سے واقف نہیں ہنوز

معنی ہیں گنگ اور تخیل ہے بے زباں
اک لفظ دوسرے کا مرادف نہیں ہنوز

نوعِ بشر میں فرقِ مساوات کیوں نہ ہو
افلاس و مال کا خط ناصف نہیں ہنوز

کیا خاک وہ حقیقتِ عقبیٰ سمجھ سکے
واعظ بقدرِ فکر بھی عاکف نہیں ہنوز

تنہا جو جی رہے ہیں گرانی کے باوجود
وہ خوش ہیں ان کے پاس مصارف نہیں ہنوز

نا اہل کتنے چین سے ہیں کائنات میں
کوئی بشر بھی ان کا مخالف نہیں ہنوز

کب تک ملے گی فکر کے زندان سے نجات
میں کیا کہوں ثمرؔ کہ وہ عاطف نہیں ہنوز

د ژ

(۶۵)

میں نہیں جانتا کہ کیا ہے ژاژ
سم کہیں پر کہیں دوا ہے ژاژ

جا نہ رختِ سفید پر اس کے
آشیاں کتنے کانٹوں کا ہے ژاژ

پتھروں پر تو اُگ نہیں سکتی
ضد کی آخر کچھ انتہا ہے ژاژ

اس کے کانٹے چبھے ہیں ہاتھوں میں
پھر بھی کہتا ہوں بے خطا ہے ژاژ

جب سمجھ میں ثمرؔ نہیں آتا
کیا بتاؤں میں تم کو کیا ہے ژاژ

'س'

(۶۶)

وسیع تر ہوا جاتا ہے عالمِ وسواس
پڑا ہے ذہن میں شاید کہ ہے نیا خناس

تمہارے حسنِ بدن کا نہ ہو سکے گا قیاس
وہ جزوِ جسم بنے تم پہن لو جو بھی لباس

خدا کے واسطے اصنام سے نہ رکھئے آس
اُگی ہوئی کبھی پتھر پہ دیکھی آپ نے گھاس

وجودِ ذہن میں تم اس طرح سے ہو پیوست
کہ جیسے جسم کی رگ رگ میں جاں، پھول میں باس

کوئی رقیب سے پوچھے معاملہ کیا ہے
مجھے وہ آج نظر آئے ہیں اُداس اُداس

اسی سہارے سے شاید میں پہنچوں منزل تک
کہ میرے عزم کا منھ چومتی ہے آج بھی آس

طلسمِ جلوۂ جاناں تری پناہ کی خیر
نہ واپس آئے ہمارے گئے جو ہوش و حواس

جنابِ شیخ یہ ہے رند مشربی کی دین
ملی یقین کی منزل جہاں نہ آس نہ یاس

یہ سن رہے ہیں کہ وہ بھی ہیں آدمی بیزار
کریں گے دم سرِ جاناں یہ سورۂ والنّاس

بچت کی کوئی بھی صورت نکال ہی لیں گے
نہیں ہے شیشوں کو ان پتھروں سے خوف و ہراس

رہِ عمل میں رواں ہوں مگر یہ خوف بھی ہے
نہ ڈھک لے آس کے سورج کو آج ظلمتِ یاس

یہ سوچ لینا تھا پہلے تجھے کہیں ساقی
وہ ایک جام سے بجھتی ہے مدتوں کی پیاس

اسی گلی میں تو ہر پھر کے مجھ کو رہنا ہے
مگر یہ کوچۂ محبوب آگیا مجھے راس

(۶۷)

کسی کو غمی راس کسی کو خوشی راس
مقدر تری بات ہر اک کو رہی راس

یہ زلفوں کے حالات کا ہے اک بڑا پیچ
کہ آتی رہی دوست اسے برہمی راس

محبت عجب چیز جہاں میں ہوئی خلق
کسی کو بہر کیف نہ آئی کبھی راس

ہمیں پر نہیں وقت پڑا ہے نیا آج
کہ آتی نہیں حیف کسی کو خوشی راس

فلک سے کرے کون شکایت ثمرؔ آہ
ہوئی کیوں بہر گاہ پلک کو نمی راس

(۶۸)

یہ جذبہ بزمِ دل میں ہے مقدس
محبت زندگی کے پھل کا ہے رس

ترے رخسار ہیں فردوس لذت
ترے گیسو ہیں عشرت خانۂ خس

کہیں شامِ اودھ گیسو میں پنہاں
کہیں چہرے میں ہے صبح بنارس

خیالِ ترکِ الفت حضرتِ دل
کہاں تک لن ترانی ہو گی بس بس

ہر اک پتھر ہے بے قیمت غلط ہے
ثمرؔ اس نوع میں شامل ہے پارس

'ش'

(۶۹)

ہے پس پردا جمالِ رُخِ جاناں آتش
یعنی رکھتا ہے چراغِ تہہ داماں آتش

سرخیاں ہیں لب لعلیں پہ حنا ہاتھوں میں ۔۔۔ دن دہاڑے لئے پھرتے ہو مری جاں آتش

لو جو چلتی ہے تو یہ عقدہ عیاں ہوتا ہے ۔۔۔ رکھتا ہے دامنِ آوازِ بیاباں آتش

مانگ میں بھر کے وہ سیندور سرِ بزم آئے ۔۔۔ ہو گئی راہِ محبت میں پریشاں آتش

سنتے ہیں دشتِ وفا میں تھا ثمرؔ ہم سے قبل
کوئی سرمستِ غزل جانِ غزالاں آتش

(۷۰)

سامنے ہے ساقیٔ رعنا غزالِ مے فروش ۔۔۔ الوداع اے دین و ایماں الفراق اے عقل و ہوش

چٹکیاں لیتا ہے دردِ عشق دل میں بار بار ۔۔۔ ضبطِ غم کے حکم سے رہتا ہوں میں لیکن خموش

میکشی کا تذکرہ تشنہ لبوں کے سامنے ۔۔۔ کیا کریں گے سُن کے ہم رودادِ بزمِ ناؤ نوش

یہ جہاں فانی ہے اسکا کچھ نہیں ہے اعتبار ۔۔۔ آسماں سے آ رہی ہے صاف آوازِ سروش

تن بہ تقدیر آج ہو جانا ثمرؔ راس آگیا
مٹ گیا دل سے مرے اندیشۂ فردا و دوش

(۷۱)

بے ہنر بن کے مُفلس و قلّاش ۔۔۔ پھرتے ہیں رہگذار میں اوباش

دل بہلنے کی صورتیں ہیں بہت ۔۔۔ بزمِ احباب، میکدہ اور تاش

آئینہ میں غمِ حیات کے آہ ۔۔۔ ایک چہرہ نہ دیکھو گے بشّاش

جس کے ملنے کی ختم ہے امّید ۔۔۔ ہم عبث اس کو کر رہے ہیں تلاش

مارے پھرتے ہیں گلیوں میں رکھ کر | سیبِ دل کی ہتھیلیوں پر قاش
ناوکِ چشمِ لطف آمادہ ! | زخم تو کچھ نہیں ہے - صرف خراش
حیف صد حیف اے جنونِ فن | کچھ لکیروں میں گھر گیا نقّاش
دونوں یک جنس ہیں مگر بے میل | فکرِ معشوق اور فکرِ معاش

تم بھی دیکھے گئے ہو سنگ بدست
مرحبا مرحبا ! ثمرؔ، شاباش

(۷۲)

ہے قریب شمع کشتہ آج پروانے کی لاش | ہو گئی مٹّی سوارت تیری، دیوانے کی لاش
تیرے وحشی کی لحد بنتی تو بنتی کس طرح | جزوِ صحرا بن گئی آخر کو ویرانے کی لاش
غیرتِ ساقی کو یہ کیا ہو گیا کوئی بتاؤ | تشنگی کے دوش پر رکھّی ہے میخانے کی لاش
فطرت ایذا پسندی تیری واضح ہو گئی | وجہِ عبرت بن گئی ہے مجھکو بیگانے کی لاش

قصّۂ غم میرا اچھایا ہے رقیبوں نے ثمرؔ
ہوتی ہے تشہیر در در میرے افسانے کی لاش

'ص'

(۷۳)

ہو گا حضور سے جو بغلگیر ایک شخص | کھینچے گا آج آپ کی تصویر ایک شخص
شیرینیٔ سخن کی ہے تقسیم یوں تو عام | پاتا نہیں ہے حصّۂ تقریر ایک شخص

صبح ازل سے تجھ سے ہوا خوش نہ آج تک
بزم جہاں میں اے فلکِ پیر ایک شخص

ہر آدمی کو شکوہ غمِ تیرگی کا ہے
بیٹھا ہے بن کے مالکِ تنویر ایک شخص

اپنی طرح سے دہر میں فنکارِ تنگدست
غالبؔ تھا ایک شخص مگر میرؔ ایک شخص

(۷۴)

اصطلاحاً جسے کہئے فلکِ پیر کا رقص
اصل میں ہے وہ مری گردشِ تقدیر کا رقص

تم یہ سمجھو کسی سورج کا ہے آغازِ نمود
جب بھی آجائے جوانی پہ یہ تنویر کا رقص

جانبِ میکدہ حوصلہ آنے والوں
تم نے دیکھا نہیں صہبائے گلوگیر کا رقص

شاید آجائے یہ سرمایہ پرستوں کو پسند
آؤ آغاز کریں دوستو تحریر کا رقص

چل کے دیکھیں تو نشاطِ غمِ دل کا عالم
صحنِ زنداں میں سنا ہے کہ ہے زنجیر کا رقص

یاس کے گھر میں اک ہنگامہ سا برپا تو ہوا
غم کی دہلیز پہ ہے ظلمتِ تدبیر کا رقص

نغمۂ فکر پہ آجائے بہر حال اگر
قابلِ دید ہو پھر مصحفیؔ و میرؔ کا رقص

(۷۵)

یارب کبھی ہمارے مکاں میں نہ آئے حرص
ہیں دشمنِ سکوں یہی منحوس پائے حرص

وہ چاہتے ہیں لاکھوں مریں ان کے نام پر
ان کی زبان پر ہے اگر کچھ تو ہائے حرص

ہے اس کی زد میں سارا جہاں تا بہ روزِ حشر
رکتے نہیں کبھی بھی کہیں پر بھی پائے حرص

ابنائے روزگار کے شکووں سے فائدہ — چلتی رہے گی شہرِ غرض میں ہوائے حرص
ہے کون جو کرے مرضِ آز کا علاج — لقمان تک کو مل نہ سکی جب دوائے حرص
دیتے رہو فریب زمانے کو دوستو — جب تک رہے بدن پہ سلامت قبائے حرص

دیکھا ہے غم کی آگ میں جلتے ہوئے انھیں
جتنے ملے ہیں مجھکو قمرؔ مبتلائے حرص

(ض)

(۷۶)

رکھتا نہ ہو جو اپنی جہاں میں دوا مرض — ایسا کسی کو بھی نہ کبھی دے خدا مرض
اک عمر کے ریاض سے اربابِ عشق میں — اتنا بڑھا کہ بن گیا شوقِ وفا مرض
وہ پوچھتے ہیں، لوگو بتاؤ میں کیا کہوں — آزار کون آپ کو ہے اور کیا مرض
سر پھوڑ کے وہ مر گیا صحرائے زیست میں — تنہائی خیال کا جسکو ہوا مرض
اے چارہ گر نہ فکرِ مداوائے درد کر — بے سود ہے بڑھائے اگر خود دوا مرض
بیٹھیں نہ لوگ کوہکن و قیس کے قریب — سُنتے ہیں دونوں ہی کو ہے عارض بُرا مرض

عالم یہ ہے نماز بھی ہونے لگی قضا
جب سے قمرؔ کو عشقِ بتاں کا لگا مرض

(۷۷)

روز اُٹھا کر سو آفاتِ لب و عارض — ہم کریں گے مداراتِ لب و عارض

شیخ نے بھی اسے تسلیم فرمایا ہے مسلّم مساواتِ لب و عارض
امتحانِ محبّت میں مناسب ہے محتسب کر سوالاتِ لب و عارض
ملکِ دل پہ جہاں والو بہ فیضِ غم دیکھ لو اختیاراتِ لب و عارض
کس صحیفے میں ہے لکھا ثمؔر صاحب
کیوں کریں ترکِ لذّاتِ لب و عارض

ط

(۷۸)

جان کے ہمراہ زر و مال شرط اُن سے ہے ملنے کی یہ فی الحال شرط
گھر کے بسانے کے لئے کیا کروں عقد کا ہمراز ہے جنجال شرط
زندگی آرام سے کٹ جائے گی ایک ہی انداز کی ہے چال شرط
سوہنی مل جائے گی ہر شہر میں مجھ سے لگائے کوئی مہنوال شرط
ہم نے یہی دہر میں دیکھا ثمؔر
اوج کو ہے دولت و اقبال شرط

(۷۹)

جو اُلٹتے ہیں مدّعا کی بساط سامنے ان کے کیا وفا کی بساط
پیرِ میخانہ کی نگاہوں میں شیخ جی کیا ہے اقتدا کی بساط
ہوگا مہماں ضرور اثر اک روز تم بچھاتے رہو دعا کی بساط

شیخِ مرحوم ساتھ لے جاتے کاش مرقد میں یہ ریا کی بساط
چشمِ رحمت میں حضرت واعظ کیا ہے خود سوچیئے خطا کی بساط
اس طلسم جمال کے آگے کچھ نہیں پیر تسمہ پا کی بساط
تم ثمرؔ کامیاب ہوگے ضرور
کم نہیں صاحبِ وفا کی بساط

(۸۰)

میں یہ سمجھوں اسلئے بھیجا نہ ابکی بار خط آپ کا اقرار خاموشی ہے اور انکار خط
مصحفِ رُخسار پڑھتے وقت یہ دیکھا گیا کاکل رمز آفریں کا بن گیا ہر تار خط
ٹھان لی ہے آپ نے جب سے نہیں دیں گے جواب ہم نے بھی طے کرلیا لکھیں گے ہم سو بار خط
اہتمامِ حاجب و درباں سے کچھ ہوتا نہیں پھاند کرلے جائیں گے قاصد تری دیوار خط
ہے ثمرؔ کی التجا گوشِ ترحم کے حضور
اپنی تحریروں کا صدقہ بھیج اسے دلدار خط

(ظ)

(۸۱)

کہاں ثواب کی دنیا کہاں شراب کی واعظ کبھی نہیں نہ زاہد سے کسی خراب کی واعظ
مجھے ملی کبھی فرصت نہ اضطرابِ دل سے جب پڑی مجھے بُری عادت شراب ناب کی واعظ
مری نظر ہوئی رسوا ترے غلط اصولوں سے مجھے ڈرا نہ باتوں سے کبھی عذاب کی واعظ

بہت رہے رفیقوں میں پتہ چلا فریبی ہیں — مجھے حدیں نہ دکھلا تو رہِ صواب کی واعظ

تمرؔ بتا یہ ناداں کو حیات ہے بڑی نعمت
ارے کبھی مثال اس سے نہ دے سراب کی واعظ

(۸۲)

اب تک مجھے ہے وصل کی اس رات کا لحاظ — تم نے کیا تھا جب کہ مری بات کا لحاظ
تنہا چلا تھا محفلِ جاناں کی سمت میں — دل نے کیا نہ مجمعِ آفات کا لحاظ
تم ہم سے بے رُخی نہ کر دیں کہ رسم ہے — کرتے ہیں آدمی کی ملاقات کا لحاظ
کچھ ڈر نہ شیخ کا تھا مگر میکدے میں آج — ہم نے کیا تھا اہلِ سمٰوات کا لحاظ
وعدہ وفا کریں گے بھلا وہ کہ ہے جنھیں — کچھ قول ہی کا پاس نہ کچھ بات کا لحاظ
ہم سا شریف عاشقِ بدبخت کون ہے — ہم کرتے ہیں رقیب سے بدذات کا لحاظ

دنیا بدل چکی ہے تمرؔ یہ تو سوچیے
ہے کون جو کریگا روایات کا لحاظ

’ع‘

(۸۳)

پروانہ جل کے کہتا ہے یہ روبروئے شمع — بدلی روش زمانے کی بدلی نہ خوئے شمع
کھلوا رہی ہے ٹھوکریں ہر گام پہ مجھے — تاریک راستوں میں یہی جستجوئے شمع
ملتی نہیں ہے منزلِ مقصودِ زندگی — ہے تیرہ بخت کتنا بہرجا عدوئے شمع

اک سوزِ ناتمام کی تکمیل کے لئے
پروانہ پھر چلا ہے بصد شوق سوئے شمع

کس کا چراغ جلتا ہے سورج کے سامنے
ہے خاک وقتِ صبح نمؔر آبروئے شمع

(۸۴)

دے نہ سکے اہلِ دل غم کی اگر اطلاع
شہر کا دے سکتا تھا کوئی بشر اطلاع

آپکو آنا نہ تھا ورنہ مرے مرگ کی
بھیجی گئی کتنی بار آپ کے گھر اطلاع

سلسلہ جنباں ہیں آپ غیروں سے اسکی مجھے
ہوگئی ہے آج پھر بار دگر اطلاع

تیری محبّت کی بات راز نہ رہ پائیگی
خوف یہ ہے دے نہ دیں دیدۂ تر اطلاع

خلوتِ احساس میں دِل پہ گذرتی ہے کیا
کون ہے اپنا کردوں کس کو نمؔر اطلاع

'غ'

(۸۵)

غم کا دل میں جو دیکھتے ہو داغ
اجڑے گھر کا یہی ہے ایک چراغ

رہ کے پردے میں حسن والوں کا
آسماں پہ نہ جانے کیوں ہے دماغ

یاد آتی ہے میکدے کی شام
لوگ کرتے ہیں جب بھی ذِکر ایاغ

کارواں فصل گُل کا ہے دراصل
وجہ زینت برائے گلشن وراغ

انقلابِ غم وفا دیکھو
دِل میں ہے آرزو کی جا پر داغ

چشم تر میں ہے خونِ دل کی نمود   بادۂ ناب سے رہینِ ایاغ
دیکھکر صورتیں حسینوں کی
دل تمرؔ کھِل اُٹھا ہے صورتِ باغ

(۸۶)

زندگی بھر مٹ نہیں سکتا ہے میرے دل کا داغ   راہ میں بیٹھا ہوا ہوں لیکے میں منزل کا داغ
فائدہ کیا جستجوئے التفاتِ یار سے   عمر بھر جاتا نہیں جب سعئی لاحاصل کا داغ
ڈوبتا ہوں لیکے میں گرداب میں اے موجِ بحر   اہل کشتی کا سفینے کا الم ساحل کا داغ
جس کو اربابِ خرد سمجھے ہیں خود اپنا وجود   صفحۂ ہستی پہ ہے وہ صرف آبِ گِل کا داغ
میری تنہائی کا ہے تنہا رفیقِ غمگسار
میرے دل میں ہے تمرؔ جو دوریٔ محفل کا داغ

'ف'

(۸۷)

جو کہنا ہو کہئے مگر صاف صاف   سخن ہو بہت مختصر صاف صاف
وہ کہتے ہیں کپڑوں کا رکھئے خیال   کہ لگتا ہے اچھا بشر صاف صاف
وہیں پر جبینِ عقیدت جھکاؤ   نظر آئے جو سنگ در صاف صاف
جو گذری ہو تجھ پر سرِ بزمِ یار   بیاں مجھ سے کر نامہ بر صاف صاف
سنیں ہم سے اب آپ غم کا بیاں   سرِ محفل المختصر صاف صاف

نہیں آنے کا یاں کوئی بادہ خوار
میں کہتا ہوں یار دِگر صاف صاف
خفا اپنے ہوں یا کہ ناراض غیر
میں کہتا رہوں گا ثمؔر صاف صاف

(۸۸)

جھکنے لگے ہیں شیخ بھی اصنام کی طرف
شاید برہمن آئیں اب اسلام کی طرف

خوفِ خدا سے آج لرزتی ہے موج مے
واعظ تری نگاہ نہ ہو جام کی طرف

مستقبلِ قریب ہے ہمراہ حال کے
اے کاش مُڑ کے دیکھ لو انجام کی طرف

ہنگامۂ حیات کا اک جُز ہے ہر بشر
کوئی بھی دھیان دیگا نہ کہرام کی طرف

طفلانِ شہر سنگ بدست آ رہے ہیں پھر
اے لوگو! دیکھو عاشق ناکام کی طرف

جب سے ہے عام حُسن کا جلوہ چمن چمن
اٹھتی نہیں نگاہ در و بام کی طرف

رہ جائیگا اکیلا ہر اک ناتواں کہ لوگ
رستم کی سمت جائیں گے یا سام کی طرف

اے نامہ بر وہ آئیگا کیسے یقین ہو
جس نے توجہ تک نہ کی پیغام کی طرف

تنہا ہوں میں ثمؔر کہ نہیں کوئی ہمنوا
ہر شخص آج ہے کسی خود کام کی طرف
'ق'

(۸۹)

گلبدن لالہ رُخ و رنگیں عذار و سیم و ساق
مرمریں باہوں کا ہے میرے گلے کو اشتیاق

ہم نے ان کے پاؤں پر سر رکھ دیا محفل میں آج
سارے آداب محبت رہ گئے بالائے طاق

میری قسمت میں لکھا ہے آپکے گھر کا طواف
مجھکو کیا، چکر میں ہے گر گنبدِ نیلی رواق

ہم جدا اُن سے ہوئے بھی تو بھری برسات میں
وقت کی یہ بات ہے یا کہئے اس کو اتفاق

میکدے میں قدر دانِ رند مسجد میں حریف
شیخ کی فطرت کا جزوِ خاص ہے شاید نفاق

ہر بُنِ مو سے شبِ فرقت صدا آتی رہی
الفراق و الفراق و الفراق و الفراق

عاشقی میں یوں تو گذرے لاکھ غم لیکن قمرؔ
فرقتِ محبوب کا غم دل پہ گذرا سخت شاق

(۹۰)

تجھکو اے چشمِ کرم ہو نہ ستم کی توفیق
ورنہ چھن جائیگی ہم سے جو ہے غم کی توفیق

نہ ملا اُف نہ ملا بادہ پرستی کا صلہ
نہ ہوئی مجھکو کبھی ساغرِ جم کی توفیق

وہی تلوار، وہی تیر، وہی تیشہ ہے
نگہِ ناز ہوئی تجھکو نہ بم کی توفیق

تم بھی کیا چیز ہو اب تک تمہیں اے جانِ جہاں
نہ کرم کی ہوئی حاصل نہ ستم کی توفیق

وہی خوش بخت ہیں اللہ کے بندے کہ جنھیں
اپنے خالق سے ملی ضبطِ الم کی توفیق

آج میخواروں میں چل جاتی مگر خیر ہوئی
شاملِ حال نہ تھی دیر و حرم کی توفیق

ہم قمرؔ وہ ہیں جنھیں تا حدِ امکانِ شعور
نہ کبھی ہو سکی تائیدِ صنم کی توفیق

'ک'

(۹۱)

خبرِ موسمِ گل پہونچی نہ دیوانوں تک ہاتھ رُک رُک گئے جا جا کے گریبانوں تک
یکقلم سعئ غمِ اہلِ قفس ہے بے سود فصلِ گل جب کہ ہے محدود گلستانوں تک
غمگساری کے لئے کس کو بلائے کون آئے دوڑ دیوانے کی ہے بھی تو بیابانوں تک
ہم بھی یک لحظہ تمنائے ملاقات کریں ہو رسائی جو کہیں آپ کے دربانوں تک
مجھکو یہ خوف ہے بدلے ہوئے ماحول کے ساتھ فکرِ دوراں نہ پہونچ جائے شبستانوں تک
حرم و دیر کے جھگڑوں سے بچا کر دامن بے نیازی ہمیں لے آئی ہے میخانوں تک

کیا خبر کیوں ہوئے بدنام ثمرؔ دیوانے
ہاتھ پہونچے تھے ابھی صرف گریبانوں تک

(۹۲)

وادئ عشق سے سرحدِ طور تک تجھکو ڈھونڈھا کئے ہم بہت دور تک
ہیں محبت ہی کے ہر جگہ تذکرے بزمِ پرویز سے فرشِ مزدور تک
گونجتی ہی رہی عشق کی اک صدا گوشِ تبریز سے گوشِ منصور تک
سخت تھی بالیقیں ضربِ علمِ کلیمؑ بے صدا ہو گیا سازِ باعور تک
اہلِ ایماں سے پوچھو محبت ہے کیا اس بلا میں گرفتار ہے حور تک
زندگی سلسلے ڈھونڈھتی ہی رہی ظاہری حسن سے حسنِ مستور تک

اُن کے لب پہ بھی نام ثمرؔ آگیا
بات پہونچی ہماری بہت دور تک

(۹۳)

کوئی پیغام یہ پہونچا دے مرے قاتل تک
صرف ایمان نہیں نذر ہے جان و دل تک

نگہہ ناز کا یہ تیر ہے یارب کہ کچھ اور
اک خلش ہوتی ہے محسوس جگر سے دل تک

اس کو کہہ لیجئے بدبختیٔ شوقِ دیدار
نگہہ قیس گئی بھی تو فقط محمل تک

مرتے دم تک نہ چھٹا ضبطِ وفا کا دامن
آہ پروانہ سے واقف نہ ہوئی محفل تک

اپنی کشتی کو ثمرؔ کیسے بچا سکتے تھے
جال موجوں نے بچھا رکھے تھے جب ساحل تک

(۹۴)

محفلِ حسن میں تدبیر گذر ہونے تک
غیر مغرور ہے بس تیری نظر ہونے تک

ایک اُجڑے ہوئے خطے کی حقیقت معلوم
رونقِ دشت ہے دیوانے کا گھر ہونے تک

تیرے ممنونِ عنایت ہیں غم یار کہ ہم
مطمئن ہیں غمِ دوراں کو خبر ہونے تک

ماتمِ مرگِ شبِ عیش کی مدت کتنی
یہ بھی ہے چاک گریبانِ سحر ہونے تک

ہم کہاں تک تری الفت کو چھپائیں گے کہ یہ
راز ہے دیدۂ غمناک کے تر ہونے تک

ہو کسی طرح بھی آسودگیٔ ذوقِ ستم
ہے عنایت کی نظر خونِ جگر ہونے تک

مجھکو یہ ڈر ہے بدل جائے نہ اندازِ جفا
دلِ ناکام کی آہوں میں اثر ہونے تک

اپنی رسوائی کا احساس بُرا ہوتا ہے
سجدہ بیتاب ہے شرمندۂ در ہونے تک

شب بخیر آپ تو جاتے ہیں مگر سنتے جائیں
جانے کیا حال ہو عاشق کا سحر ہونے تک

لرزشِ موج ہے اک سعئ خوش اقبال کا نام
آب بیتاب ہے پیوستِ گہر ہونے تک

کھینچیے حسرتِ شوخئ قیامت بھی ثمرؔ
عنبریں زلفوں کے تا حدِّ کمر ہونے تک

(۹۵)

محرمِ آہ رہے گا دلِ سوزاں کب تک
ہو گا ممنونِ بہاراں یہ گلستاں کب تک

غمِ جاناں سے پھرے ہیں غمِ دوراں کی طرف
دیکھیں پھر جاتے ہیں سوئے غمِ جاناں کب تک

ضبط آسان نہیں، ہے یہ جہادِ اکبر
سازِ غم پر رہوں یارب میں غزلخواں کب تک

کر چکے شیخِ حرم دستِ صنم پہ بیعت
دیکھیں ہوتے ہیں برہمن بھی مسلماں کب تک

آسرا ہم بھی لگائے ہوئے بیٹھے ہیں ثمرؔ
دیکھیے ہوں نگہِ ناز کے احساں کب تک

(۹۶)

غمِ ہستی کے حدِ غم سے گذر جانے تک
ہم ہیں چپ عشرتِ فردا کے قریب آنے تک

یوں تری مصلحتِ جور و ستم جو بھی ہو
ہم تو فرزانے ہیں چیخ اٹھتے ہیں دیوانے تک

ایک افسانہ در افسانہ ہے رودادِ وفا
میرے مرنے سے تری زلف بکھر جانے تک

کیا بھروسہ ہے ترا ندرتِ آئینِ جنوں
تو نے بدلے ہیں کئی رنگ بہار آنے تک

عشرتِ صحبت و خورشی وقتی و تکمیلِ نشاط
یہ تماشے ہیں فقط بزم کے اُٹھ جانے تک

شہر خود اپنے ہی ہنگامے سے کب فارغ تھا
ذوقِ فریاد لے آیا مجھے ویرانے تک

ہم پہ کیا کیا نہیں گذری ہے خدا ہی جانے
آتشِ عشق میں تپ تپ کے نکھر جانے تک

اس قدر خواہشِ تجدیدِ نظارہ ہے کہ بس
ذہن پہ نقشِ خد و خال اُبھر آنے تک

مجھکو معلوم ہے پردے کی حقیقت اے دوست
کہ بھرم اس کا ہے قائم مرے مرجانے تک

زخمہائے دلِ ناکام کا ہوتا نہ علاج
ہم جو رہتے کہیں احباب کے سمجھانے تک

عشق کی آگ میں جلنا بھی گوارا ہے مگر
خاک ہو جائیں گے ہم دادِ وفا پانے تک

آپ پوچھیں تو سہی ہم بھی کہیں گے سب کچھ
چپ ہیں بگڑی ہوئی تقدیر سنور جانے تک

بھول کر بھی تو نہ آیا کبھی توبہ کا خیال
ہوش میں ہم نہ رہے زلف کے لہرانے تک

کیا خبر ہوتا ہے کیا غنچۂ خاطر کا مآل
اک تبسّم کے ترے لب پہ بکھر جانے تک

در خورِ عرضِ مضامین بھی ہوتے ہیں ثمرؔ
ذوق محدود نہیں دادِ وفا پانے تک

(۹۷)

نعمتِ غم تو نہ محدود رہی کچھ ہم تک
پہونچی آدمؑ سے یہ میراث بنی آدم تک

تھا مداوائے غمِ عشق تو ممکن لیکن
رہ گئے صاحبِ غم مصلحتِ ماتم تک

ساری دنیا کو تمنائے محبت ہوتی
ہوتا محدود جو انجامِ وفا بس غم تک

رات بڑھتی ہی رہی زلفِ مسلسل کی طرح
جیتے جی صبح کی تو یہ نہ پہونچی ہم تک

اے نگاہِ غلط انداز تری عمر دراز
تیرا احسان نہ ہم بھولیں گے مرتے دم تک

میکدے میں ترے کیوں شور اُٹھا اے ساقی
ایک ٹوٹا ہوا پیمانہ جو آیا ہم تک

دہر میں غم کی کشاکش سے ملی کس کو نجات
عقدۂ زیست سے اُن زلفوں کے پیچ و خم تک

وقت کی بات ہے رندوں کی یہ خوش اقبالی
طلب جام کے احسان اٹھائیں جم تک

اس پہ جھگڑا ہے ثمرؔ کون چکائے اس کو
دل کی جو بات تھی کیوں پہونچی وہ چشم نم تک

"گ"

(۹۸)

لگائے دل کے جو اُجڑے ہوئے دیار میں آگ
خدا کرے کہ لگے اُس بھری بہار میں آگ

مدد کا وقت ہے یا حضرتِ جنوں آؤ
لگی ہوئی ہے گریباں کے تار تار میں آگ

نہ کوسئے کہ یہ ناکامِ زندگانی ہے
لگائیے نہ کسی غمزدہ کے پیار میں آگ

کہاں ہیں حوصلہ مندانِ دار۔اہل جہاں
لگا دے بڑھ کے کوئی دورِ انتشار میں آگ

ثمرؔ تباہ ہوئے ان کے پہلے وعدہ سے
لگا سکے نہ یہ آغازِ اعتبار میں آگ

(۹۹)

بے نیازِ سرور ہیں ہم لوگ
نشۂ غم میں چور ہیں ہم لوگ

جھوٹ ہے اہتمام دار و رسن
سچ یہ ہے بے قصور ہیں ہم لوگ

پتھروں سے نہ کیسے ٹکرائیں   جذبۂ ناصبور ہیں ہم لوگ

اس کا غم ہے، ثمرؔ قیامت ہے!

اپنے مرکز سے دور ہیں ہم لوگ

'ل'

(۱۰۰)

جب سے ہوا ہے قاصدِ غم باریابِ دل   بڑھتا ہی جا رہا ہے مرا پیچ و تابِ دل

بجتا ہے تیری یاد کے گیتوں پہ رات دن   مضرابِ آہِ سرد سے میرا ربابِ دل

کب تیری صبح ہو گی بتا دے شبِ فراق   خیمہ گرا بدن کا وہ ٹوٹی طنابِ دل

اعلانِ عشقِ یار نہ کر دے نکل کے یہ چیخ   پاسِ وفا بھی فرض ہے خانہ خرابِ دل

جانِ ثمرؔ علاجِ ثمرؔ ہے سکونِ وصل

ورنہ کہاں یہ مٹنے کا ہے اضطرابِ دل

(۱۰۱)

سامنے کھُل کے نہ آیا وہ مرا جانِ غزل   ہائے افسوس نہ نکلا کبھی ارمانِ غزل

کون تاریک ضمیرانِ ادب کو یہ بتائے   شمعِ احساس سے روشن ہے شبستانِ غزل

ہم نے مانا کہ ہوئے منزلِ ابہام میں قتل   ہیں مگر زندۂ جاوید شہیدانِ غزل

آج کا شاعر بے ربط ہے دیوانۂ وقت   کیوں عبث باندھے بیچارے پہ بہتانِ غزل

میرؔ و غالبؔ پہ نہ آتشؔ پہ ہے موقوف ثمرؔ   مدت العمر سے میں بھی ہوں ثناخوانِ غزل

(۱۰۲)

جانِ جہاں آنکھ سے پنہاں ہے کیا آجکل
ہر دو سرا بن گیا ماتمکدا آجکل

بہتر ہے یہ چھوڑ دے شوقِ سفر آدمی
ہے پُر خطر ہم نفس ہر راستا آجکل

سب قدرداں اُٹھ گئے دنیا سے سُن لیجئے
بیکار ہے ماننے ذکرِ دفا آجکل

اُن سے نہ رکھ کچھ وفا کی آس اس دور میں
جب دہر میں عام ہے جور و جفا آجکل

دے قوم کو زندگی جو بالیقیں اے ثمرؔ
یہ تو بتا کون ہے معجز نما آجکل

(۱۰۳)

احساس کی رگوں نے بنایا مکانِ دل
عالم میں اس طرح سے ہوا عنفوانِ دل

دنیا مخالفت کے بہانے کرے تلاش
سنتے سناتے جائیں گے ہم داستانِ دل

اے ہمزباں تو عشق کا سوزِ دروں نہ پوچھ
خلقت سے پہلے جل گئے سب استخوانِ دل

ہے شیخ کا حرم تو برہمن کا بتکدہ
مرکز عقیدتوں کا ہے تنہا مکانِ دل

کیونکہ میں اس کو ترک کروں بولئے ثمرؔ
دلچسپ و دلپذیر بہت ہے بیانِ دل

'م'

(۱۰۴)

تنگ آئیں کس طرح نہ غمِ زندگی سے ہم
کرتے نہیں شکایتِ غم تک کسی سے ہم

جب سے جلا ہے فصل بہاراں میں آشیاں
ڈرنے لگے ہیں تذکرۂ روشنی سے ہم

کہتے ہیں حالِ غم تو بُرا مانتے ہیں آپ
کیا شکوہ سنج بزم میں ہیں آپ ہی سے ہم

آؤ کہ بے چراغ ہے یہ بزمِ انتظار
اُلجھے ہوئے ہیں زلفِ غمِ تیرگی سے ہم

ترکِ تعلقات سے بنتا نہیں ہے کام
عاجز ثمرؔ ہیں کشمکشِ دوستی سے ہم

(۱۰۵)

تم تو ہو پیکرِ صد ناز تمہیں کیا معلوم
ستم و جور کے انداز تمہیں کیا معلوم!

میرے زخموں کو نہ چھیڑو تمھیں رونا ہوگا
شمع احساس ہے گلباز تمہیں کیا معلوم

عقدۂ عشق جو کھُل جائے تو ہستی ہو تمام
زندگی اپنی ہے اک راز تمہیں کیا معلوم

آج بھی گونجی ہوئی دور بیابانوں میں
میری ہستی کی ہے آواز تمہیں کیا معلوم

ضبطِ آثارِ محبت کی بدولت ہے ثمرؔ
محفلِ عشق میں ممتاز تمہیں کیا معلوم

(۱۰۶)

گھات میں ہر جگہ لگے ہیں غنیم
المدد الغیاث ربِّ کریم

پہلے ہی سے کریلا کڑوا تھا
اس پہ طرّہ کہ چڑھ گیا ہے نیم

بے بہا مثلِ منفرد فنکار
ہے وہ موتی لقب ہے جسکا یتیم

ابرو و مژہ کے رسالے ہیں
آڑ میں اک کتاب کی ہیں غنیم

تیری تیغِ نظر کے ہیں ممنون — تنِ مجروح اور قلبِ دو نیم
تو نے ہر در کی خاک چھنوائی — تیرے کرتوت یہ ہیں نفسِ لئیم
کسی نازک بدن کے ساتھ تھے کل — اک خیاباں میں دو لحیم شحیم
میکدے میں جنابِ شیخِ حرم — رندِ مشرب ہیں واجب التعظیم

بات کیا ہے تمؔ ہوئے بیہوش
سونگھ کر گیسوؤں کی آپ شمیم

'ن، ں'

(۱۰۷)

ہو گیا خواہشِ دیدارِ سرِ طور کا خون — پی گئی برقِ نظر دیدۂ بے نور کا خون
بے سبب کر دیا خورشید پرستو! افسوس — صبح کی پہلی کرن نے شبِ دیجور کا خون
شہر کے ہر نئے اخبار کی سرخی ہے گواہ — رنگ لایا ہے ترے عاشقِ مشہور کا خون
یوں تو بے پردہ سرِ بزم نہ آ کر بیٹھو — کیا ضروری ہے کرو حسن کے دستور کا خون
لوگ سمجھے مری آنکھوں سے رواں ہیں آنسو — پانی بن بن کے بہا جب دلِ مجبور کا خون
حسرتِ مرگ میں تا اہلِ وفا جیتے رہیں — زینتِ دار بنایا گیا منصور کا خون
زیبِ تن سرخ شلوکا یہ کہاں سے ہوتا — کام آتا نہ اگر عاشقِ رنجور کا خون
زردیٔ عارضِ جاناں کا کروں کیسے علاج — غیر ممکن ہے میسر ہو دلِ حور کا خون
ناتوانی کو نہ کم سمجھیں یہ تنقید نژاد — باعثِ قوتِ شاہیں نہ ہو عصفور کا خون

تیل کی جا پہ یہ دولت کا کرشمہ دیکھو		کارخانوں میں جلا کرتا ہے مزدور کا خون
جس کو دعویٰ سخن ہو ثمرؔ اس سے یہ کہو
علم موسیٰ نے کیا بلعم باعور کا خون

(۱۰۸)

کم گفتار غنچہ دہن جانِ چمن		اے دلدار گل پیرہن جانِ چمن
ہم پر پھینک جو سخت تر لفظوں کا ہے		لب پہ بار شیریں سخن جانِ چمن
ارماں سوز ہونا غلط ہے جان لے		دل آزار سیمیں بدن جانِ چمن
پتھر ٹال راہِ وفا کا ہم نوا		یہ دیوار ہے میر ہن جانِ چمن
جو تھے غیر تجھکو ثمرؔ کہنے لگے
آخر کار فخر وطن جانِ چمن

(۱۰۹)

خود آکے دابتا ہے جو مجھ خستہ تن کے پاؤں		جی چاہتا ہے چوم لوں اس گلبدن کے پاؤں
اک تیشۂ جفا کا سہارا کیا قبول		راہِ وفا میں تھک گئے جب کوہکن کے پاؤں
ہر ذرۂ چمن کی زباں پر ہے الفراق		مجھ تک قفس میں آتا جو ہوتے چمن کے پاؤں
نقشِ قدم سے گلشنِ ایماں کی ہو نمود		آئیں اگر حرم میں بتِ سیمتن کے پاؤں
کوئی نہیں یگانہ ثمرؔ اس دیار میں
آکر تھکے کہاں یہ غریب الوطن کے پاؤں

(۱۱۰)

دامن کو چاک کر کے سئے جا رہا ہوں میں
ابتک خراجِ عشق دئیے جا رہا ہوں میں

یہ بھی ہے سچ کہ موت سے بدتر ہے زندگی
یہ بھی درست ہے کہ جئے جا رہا ہوں میں

میں بیخودی و ہوش کا قائل نہیں ثمرؔ
کوئی پلا رہا ہے پئے جا رہا ہوں میں

(۱۱۱)

میں ترے عشق کا اظہار کروں یا نہ کروں
خود کو رسوا سر بازار کروں یا نہ کروں

تجھ سے الفت کا میں اظہار کروں یا نہ کروں
تیرے جذبات کو بیدار کروں یا نہ کروں

اپنے ہاتھوں سے کوئی مجھ کو عطا کرتا ہے
جامِ گلرنگ سے انکار کروں یا نہ کروں

ترکِ الفت کا رقیبوں کے بھرے مجمع میں
تم بتاؤ کہ میں اقرار کروں یا نہ کروں

عشق زندہ پسِ منصور ابھی تک ہے ثمرؔ
اعتبارِ رسن و دار کروں یا نہ کروں

(۱۱۲)

نہ جانے مجھکو یہ کیا ہوا ہے کہ گیت میں آج گا رہا ہوں
خود اپنے رازِ الم کو شاید برنگِ دیگر چھپا رہا ہوں

تری تجلّی وہ تیرا جلوہ وہ تیری صورت کی ضو فشانی
کہ جس سے شمعِ سخن کو اپنی میں دھیرے دھیرے جلا رہا ہوں

ستم کی رسم قدیم بدلی نہ تیرا طرزِ جفا نیا ہے
عجیب لذّت ترے تغافل میں پھر بھی کیوں آج پا رہا ہوں

مرا یہ ذوقِ سفر مکمل نہ ہو سکا ہے نہ ہو گا شاید
چلا تھا جس منزلِ وفا سے اسی پہ واپس پھر آ رہا ہوں

مصیبتوں کے یہ سخت طوفاں یہ گردشِ تیز اسپ دوراں
میں ایسے ماحولِ پُر خطر میں سمجھ کے کچھ مسکرا رہا ہوں

اگر نہ تابِ مقاومت ہو تو زندگی خود ہے ننگِ ہستی
اسی لئے زد پہ بجلیوں کی میں آشیانہ بنا رہا ہوں

یہ ٹوٹے دل کی صدا مگر ہے نہیں کوئی گیت زندگی کا
شکستہ سازِ حیات پہ میں بلا تکلّف جو گا رہا ہوں

(۱۱۳)

کسی کی چشمِ کرم گر شریکِ حال نہیں — تو کیا سبب ہے طبیعت میں اعتدال نہیں
جُدا حرم سے ہیں آدابِ میکدہ واعظ — مقام ادب کا ہے یہ جائے قیل و قال نہیں
وفا کرو نہ کرو بے رُخی بُری شے ہے — کبھی کی رسم تھی اتنا تمہیں خیال نہیں
نہ جانے کتنی حدیثیں ہیں غم کی میرے پاس — میں کیا کروں کہ مجھے اذنِ عرضِ حال نہیں
مگر کچھ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں لوگ جنھیں
نزاکتِ غمِ احباب کا خیال نہیں

(۱۱۴)

لوگ جو چاہیں کہیں اصل میں ایسا تو نہیں
زندگی مظہر خلقت کا تماشا تو نہیں

جس سے سرگوشیاں کرتے ہیں اُسی سے اکثر
پوچھتے ہیں وہ کسی نے ہمیں دیکھا تو نہیں

ہائے وہ نشۂ گفتار کہ واعظ کو ہے فکر
شہر میں یا کسی دیہات میں جلسہ تو نہیں

بحث میخواروں سے کس واسطے ہے شیخِ حرم
یہ عبادت تو نہیں یہ بھی فریضہ تو نہیں

کیا ضروری ہے کہ ہر بزم میں شرکت ہی کریں
شعر پڑھنے کا ثمرؔ آپ کو ہوکا تو نہیں

(۱۱۵)

ستم کشوں کے مقدر میں لکھ گئیں آہیں
وہی تو ہوگا زمانے میں آپ جو چاہیں

وسیع دشتِ محبت ہے اور تنہا ئی
اُداس اُداس نظر میں ہیں بے نشان راہیں

مرے خیال کو ہوتا ہے ارتعاش اب تک
جھکی جھکی سی نگاہیں وہ مرمریں باہیں

کشاکشِ غمِ دنیا غمِ محبّت میں
نہ چاہیں بار الٰہا کسے کسے چاہیں

برنگ برق بلا قہر کی نگاہ کی چوٹ
نگاہ اوٹ محبّت کی پرورش گاہیں

تمہارا نام نہ بھولے سے لب پہ آجائے
کسی کے قتل کی پھیلی ہوئی ہیں افواہیں

ثمرؔ جو کوچۂ جاناں کی سمت جاتی ہیں
ہزاروں بار کی روندی ہوئی ہیں وہ راہیں

(۱۱۶)

جناب شیخ کے گھر آج اجتماع نہیں ۔۔۔ نئے گناہ کی شاید کوئی متاع نہیں
کبھی تو دِل کی کہانی سُنے گی یہ دُنیا ۔۔۔ یہ مانا آج اُسے فرصت سماع نہیں
نکل گئی مرے قاصد کے منھ سے جانے کیوں ۔۔۔ وہ بات جو کہ سزاوار استماع نہیں
حدیثِ درد ہے جزوِ فسانۂ ہستی ۔۔۔ دلِ غریب کی واللہ اختراع نہیں
قدم قدم پہ ہیں نقشِ قدم کی قندیلیں ۔۔۔ وہ کون ہے کہ جو پابند اتّباع نہیں
اُجاڑنا دلِ ناداں کا ہے بہت آساں ۔۔۔ یہ ملک وہ ہے جہاں شعبۂ دفاع نہیں

تمؔر ہم اپنے کو مفلس سمجھ رہے ہیں بجا
ہمارے پاس غمِ عشق کی متاع نہیں

(۱۱۷)

زندگی جوہرِ الماس کہاں سے لاؤں ۔۔۔ خلشِ لذّتِ احساس کہاں سے لاؤں
رنگ نزارِ غمِ ہستی میں تسلّی کا خیال ۔۔۔ آئے جو میرے لئے راس کہاں سے لاؤں
دولتِ یاس بڑی چیز ہے تسکیں کیلئے ۔۔۔ یہ بھی سرمایہ نہیں پاس کہاں سے لاؤں
پھول کاغذ کے بنا ڈالے بہت سے لیکن ۔۔۔ پھول کی قدرتی بو باس کہاں سے لاؤں
بحر و بر میں کوئی ملتا ہی نہیں راہنما ۔۔۔ خضرؑ کے ساتھ ہیں الیاسؑ کہاں سے لاؤں
حضرت شیخ ہوئے جسکی بدولت مشہور ۔۔۔ میں وہ سلجھا ہوا خنّاس کہاں سے لاؤں
رام کو ڈھونڈھنے والوں سے تمؔر یہ کہہ دو ۔۔۔ رام کا ہو گیا بن باس، کہاں سے لاؤں

(۱۱۸)

بدلی ہوئی جہاں کی فضاؤں کے درمیاں / رہزن ملیں گے راہنماؤں کے درمیاں

ہر حرفِ التجا کے گریباں کا تار تار / سو بار بٹ چکا ہے خداؤں کے درمیاں

پایا ہے جن بزرگ نے شیخِ حرم لقب / وہ رہ چکے ہیں ماہ لقاؤں کے درمیاں

حرکت ذرا جو آپ نے کی یہ مسل گیا / اک دل پڑا ہے آپ کے پاؤں کے درمیاں

مجھ کو کبھی بھی کوچۂ کاکل نہ آیا راس / لیکن رقیب خوش ہیں بلاؤں کے درمیاں

ہمراز آسمان و زمیں دے چکے جواب / بسنا پڑے گا اب تو خلاؤں کے درمیاں

یہ بھی تو سوچ لیجئے کچھ فرق چاہیئے / غارت گرانِ دل کی سزاؤں کے درمیاں

ہم تھے ہمارے فرق پہ بارانِ سنگ تھا / تہذیب سو رہی تھی گھٹاؤں کے درمیاں

یہ مسئلہ وجود کا حل کیسے ہو ثمر / ہر پیڑ گم ہے اپنی جٹاؤں کے درمیاں

(۱۱۹)

نگاہِ ناز کو موجِ شراب سمجھے ہیں / رُخِ صبیح کو ہم آفتاب سمجھے ہیں

ہم اضطرابِ محبت کو ایک عمر کے بعد / حسین لغزشِ دورِ شباب سمجھے ہیں

عجیب چیز ہیں یہ شیخ کو خدا سمجھے / خدا کو اصل میں تنہا جناب سمجھے ہیں

نظر جھکائے ہوئے آئے ہیں وہ محفل میں / حیا نے آج رموزِ شباب سمجھے ہیں

ہمارے قصۂ غم کو ثمر یہ دیوانے / حدیثِ لذتِ شعر و شراب سمجھے ہیں

(۱۲۰)

کون سی بے مائگی اس دور کے فن میں نہیں — گوہرِ احساس اہلِ دل کے دامن میں نہیں
ہے الگ ہر تارِ داماں تا بہ کے بخیہ گری — قوّتِ برداشت اتنی نوکِ سوزن میں نہیں
لذّتِ تنہائی و آزادیٔ گفتار دیکھ — بات جو صحرا میں ہے وہ صحنِ گلشن میں نہیں
بیکسیٔ ذوقِ خود آرائی دیکھا چاہیے — کوئی موسیٰؑ آجکل وادیٔ ایمن میں نہیں
آہ کرنا ضبطِ غم سے ہے بہت آساں مگر — جو لپک شعلے میں ہے وہ دودِ گلخن میں نہیں
تشنگیٔ ذوقِ اربابِ غرض سے ہوں خجل — ایک قطرہ خون کا باقی مرے تن میں نہیں
تیرے فنِّ قتل پہ الزام آسکتا نہیں — تیغ کا کوئی نشاں جب خطِّ گردن میں نہیں
واعظِ ناداں عبث ہے دشمن ارباب سے — فائدہ جب کوئی بھی آپس کی ان بن میں نہیں

کل ثمرؔ یہ کہہ رہے تھے مجھ سے اربابِ شعور
لذّتِ فکر و فراست آج کے فن میں نہیں

(۱۲۱)

مختصر لفظوں میں بس اتنی ہے میری داستاں — ایک مدّت سے ہوں ماتمدارِ عمرِ رائگاں
دل میں کیوں لاتے ہو تم ترکِ تعلق کا خیال — ایک کیا سو بار ہم دیں گے وفا کا امتحاں
چلنے والے جادۂ الفت میں چلتے ہی رہے — قافلے کو روکتی کیا خاک آوازِ سگاں
ہم نفس اس ناصیہ سائی میں ایک لذّت بھی ہے — میری پیشانی کو بوسے دے رہا ہے آستاں
کیا بتائیں ہم ثمرؔ مجبوری واماندگی — کارواں سے ہم چھٹے اور ہم سے چھوٹا کارواں

(۱۲۲)

نہ یہ پوچھو کہ ہم کو لوگ کیوں دیوانہ کہتے ہیں
سنو ہم ابتدا سے عشق کا افسانہ کہتے ہیں

جناب شیخ یہ وقت تہجّد اور یہ سرمستی
کدھر حضرت نکل آئے اسے میخانہ کہتے ہیں

نہیں معلوم توبہ شیخ کے نزدیک کیا شے ہے
شکستِ توبہ کو ہم لغزشِ مستانہ کہتے ہیں

خموشی اپنا شیوہ ہے عموماً ان کی محفل میں
مگر جو بات کہنے کی ہے، بیباکانہ کہتے ہیں

تمؔر وہ پوچھتے ہیں نام تم سے کیوں نہیں کہتے
مجھے دیوانہ کہتے ہیں مجھے دیوانہ کہتے ہیں

(۱۲۳)

ازل سے اہلِ عشق دل کی بات کہتے آئے ہیں
پرانی ہو چکی جو واردات کہتے آئے ہیں

غمِ حیات کے نقیب اپنی اپنی موت کو
نجات کہتے جائیں گے نجات کہتے آئے ہیں

غموں کی کشمکش کو ہم سکونِ دل کے واسطے
کھلی ہوئی علامت حیات کہتے آئے ہیں

کسی کی مسکراہٹوں کے حادثہ کو اہلِ دل
بنام اعتبار التفات کہتے آئے ہیں

کسی کا ذوقِ بازیٔ جفا نہ کم ہو اس لئے
تمؔر ہم اپنی جیت کو بھی ہار کہتے آئے ہیں

(۱۲۴)

وفادار محبّت ہیں وفا کی شان رکھتے ہیں
مثالِ شمع سوزاں جلنے کا ارمان رکھتے ہیں

محبّت میں تری جینا محبّت میں تری مرنا
اصولِ زندگی ہم کس قدر آسان رکھتے ہیں

بھروسہ دل کا دیوانوں کو رہتا ہے زمانے میں — یہ وہ بدبخت ہیں جو دوست بھی نادان رکھتے ہیں
ہم اپنے چاہنے والوں کے خود ممنونِ احساں ہیں — وہ ہوں گے دوسرے جو خوامخواہ احسان رکھتے ہیں

ثمرؔ جب مائلِ شعر و سخن ہوتے ہیں محفل میں
قلم ہاتھوں میں اپنے اور منہ میں پان رکھتے ہیں

(۱۲۵)

حسنِ صفات اور کبھی حسنِ ذات میں — کھائے فریب ہم نے بہت عشقیات میں
جس طرح ذات جلوہ نما ہے صفات میں — ضم ہیں یوں ہی صفات بھی تو یہ ذات میں
اک مستقل کتاب ہے رازِ حدیثِ عشق — پیدا ہے ایک بات نئی بات بات میں
اس سعیٔ نامراد کے قائل نہیں کہ ہم — خود کھو گئے ہیں جستجوئے التفات میں

بے کیفیٔ حیات کا ماتم نہ کیجئے
یوں بھی جیئے ہیں لوگ ثمرؔ کائنات میں

(۱۲۶)

حسن والوں کا اعتبار نہیں — ان میں کوئی وفا شعار نہیں
اک کسک ہوتی ہے مجھے محسوس — تیرِ مژگاں تو دل کے پار نہیں
رازِ الفت چھپے تو کیسے چھپے — اضطراب آپ پردہ دار نہیں
دل نے کیا کچھ کیا نہ میرے ساتھ — مجھکو اپنوں کا اعتبار نہیں
ہوں قفس میں ثمرؔ یہ اچھا ہے — میں رہینِ غمِ بہار نہیں

(۱۲۷)

وہ اور ہوں گے جو فطرت کی بات کرتے ہیں
وفا کے بندے محبّت کی بات کرتے ہیں

شمار انھیں کا ہے اہلِ خرد کے زمرے میں
جو حسبِ وقت ضرورت کی بات کرتے ہیں

سُنا ہے میں نے کسی مصلحت کے پیشِ نظر
یہ بے وفا بھی محبّت کی بات کرتے ہیں

جنابِ شیخ نہیں اپنے ہوش میں شاید
یہ آج بادۂ جنّت کی بات کرتے ہیں

کسی رقیب سے وہ کہہ رہے تھے کل طنزاً
تمرؔ بھی ترکِ محبّت کی بات کرتے ہیں

(۱۲۸)

جو دل کے ساتھ جگر کا بھی انتظام کریں
تو آپ دعوتِ مژگاں کا اہتمام کریں

ہنوز دور ہے فصلِ بہار حضرتِ دل
خزاں کے دشت میں کچھ روز ابھی قیام کریں

یہ آرزو ہے جو فرصت ملے ترے غم سے
ہم اپنے دل کو شریکِ غمِ عوام کریں

قفس سے ہوگی رہائی تو کیا مگر اے دل
بہ اقتضائے خلش سعئ ناتمام کریں

کبھی ہوا نہ یہ اربابِ میکدہ کو خیال
علاجِ بیکسئ رندِ تشنہ کام کریں

رقیب چاہتے ہیں تم کو اس لئے شاید
لہو لگا کے شہیدوں میں اپنا نام کریں

تمرؔ یہ بات نہیں آپ کے لئے زیبا
کہیں پہ صبح کریں اور کہیں پہ شام کریں

(۱۲۹)

تجھی سے پھر اے مکرنے والے میں وعدۂ دید چاہتا ہوں
سوادِ غم خانۂ وفا میں شعاعِ امید چاہتا ہوں

غمِ محبّت کے نکتہ چینوں تمہاری تنقید چاہتا ہوں
فسانۂ عشق نامکمّل ہے اس کی تمہید چاہتا ہوں

بٹھا رہا ہوں جریدۂ عشق پر میں نقش اپنی بیکسی کا
وفا بنام وفا کسی سے خلافِ اُمیّد چاہتا ہوں

مقابلہ ہے نگاہِ الفت کا آجکل سالکِ جفا سے
شریعتِ عشق میں امامِ وفا کی تقلید چاہتا ہوں

شبِ فراق اُن کا منتظر ہوں ثمرؔ یہ کیا ہو گیا ہے مجھکو
اندھیری راتوں میں کیا غضب ہے کہ نورِ خورشید چاہتا ہوں

(۱۳۰)

آج تو آپ کھوئے کھوئے ہیں
سچ بتائیں کہ کس کو رو دئے ہیں

تجھکو دل دیکے کیا ملا ہم کو
خار خود اپنے حق میں بوئے ہیں

رات یہ واقعہ بھی گذرا ہے
تیرے غم سے لپٹ کے روئے ہیں

ہجر کے غم کا اضطراب نہ پوچھ
چونک اُٹھے ہیں جب بھی سوئے ہیں

کوئی ہم کو بتا سکا نہ ثمرؔ
ہم کہاں کس جگہ پہ کھوئے ہیں

(۱۳۱)

مسلسل تجربے شامل ہیں میرے ضبطِ شیون میں
لگی ہے آگ اکثر آہِ دل سے بھی نشیمن میں

وہی معصوم ڈھیلے ڈھالے ابرو تن گئے مجھ سے
ہے فصلِ دو کماں شاید جوانی اور لڑکپن میں

اسیرِ مسلکِ خود رائی و پند و نصیحت ہیں
نہیں کچھ فرق رندوں کیلئے شیخ و برہمن میں

جنابِ شیخ کو رفتارِ دنیا سے غرض کیا ہے
سدا اُسکو ہری سوجھے گی جو اندھا ہو ساون میں

ثمرؔ اب عزتِ قرآں کا بھی اللہ حافظ ہے
حمائل دستِ ساقی ہو گئے واعظ کی گردن میں

(۱۳۲)

مجھکو فریبِ گردشِ ایام سے فرصت کہاں
دل کے سنبھلنے کی زمانے میں کوئی صورت کہاں

کہہ دے یہ اہلِ کارواں سے کوئی میں مجبور ہوں
عزمِ سفر باقی سہی پاؤں میں اب طاقت کہاں

مجھکو بھی یاد آتی ہے اکثر بزمِ خوبانِ چمن
لیکن میسر خواب میں بھی ہے وہ صحبت کہاں

میت ترے وحشی کی اب تک حلقۂ ماتم میں ہے
ٹوٹا پسِ مردن طلسمِ حلقۂ وحشت کہاں

ہم شکوہ سنجِ یاس بن کر رہ سکیں گے کب ثمرؔ
اتنی غمِ تقدیر کی فکروں سے ہے فرصت کہاں

تضمین بر اشعار میرزا غالب مرحوم

کرتے نہیں ہیں رند تکلّف شراب میں
کتنی سکون بخش ہے مے اضطراب میں
ہر غم کی یہ دوا ہے جہانِ خراب میں
(۱) "کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں"

ذوقِ نصیریت ترا مسجود ایک ہے
بے مثل۔ صاحبِ کرم وجود ایک ہے
فی الاصل جب کہ بندہؑ و معبود ایک ہے
(۲) "اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں"

غیبت کی بحث چھیڑ نہ اے شیخ روز روز
آگاہ اس سے ہے دلِ مومن بہ فیضِ سوز
ہے نورِ شمعِ عالمِ امکاں ضیا فروز
(۳) "آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں"

اہلِ کسا پہ لاکھوں سلام اور صد درود
ہوتے نہ یہ تو ہوتا نہ یہ عالمِ وجود
پردے میں نورِ حق ہے بہ آرائشِ نمود
(۴) "ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں"

دل مجھکو لے چلا ہے تو آج سوئے دوست
جمگھٹ ہے آشناؤں کا دیکھو بہ کوئے دوست
قنبرؓ تک آگیا ہوں تو ہے جستجوئے دوست
(۵) "غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں"

و

(۱۳۴)

دنیا کا جو جی چاہے سمجھتی رہے ہم کو
ہم کعبہ سمجھتے ہیں ترے نقشِ قدم کو

کیا ہو گیا ساقی ترے اندازِ کرم کو
میخوار بہک کر نہ چلے جائیں حرم کو

آئینہ ہے اور آئینے کے سامنے تم ہو
بس دل ہی سمجھتا ہے اس اندازِ ستم کو

جذبات کی سرحد کے پرے جا کے عجب کیا
اللہ سمجھنے لگے دنیا جو صنم کو

میں چپ ہوں مگر شہر میں ہوتے ہیں یہ چرچے
کیا ہو گیا پیمانِ محبّت کے بھرم کو

تنہائی ہے فرقت ہے اندھیرا ہے گھٹن ہے
کہہ دو غمِ تقدیر کے داغوں سے کہ چمکو

آئے وہ تماشائے جہاں دیکھ لے دِل میں
دیکھا نہ ہو جس شخص نے بھی ساغرِ جم کو

کیا پاسِ وفا اس کے سوا اور بھی کچھ ہے
ہم دل سے لگائے ہیں ابھی تک ترے غم کو

ان شیریں لبوں سے ہے بُری تلخیٔ گفتار
گھولا نہ کرو بہرِ خدا شہد میں سم کو

آنسو کسی انسان کے قابو میں نہیں ہیں
الزام نہ دو کوئی مرے دیدۂ نم کو

چہروں کی نمائش میں ٹھہر جائیں تو کیسے
پہچاننے والے نہ کہیں دیکھ لیں ہم کو

(۱۳۵)

یہ بھی کیا! حسن بہ ایں قدر پشیمان نہ ہو
آئینہ سایۂ گیسو سے بھی حیران نہ ہو

سات پردوں میں نہاں ہو کے سنورنے والے
دیکھ شیرازۂ کونین پریشان نہ ہو

ڈوب جائے مری کشتی تو بلا سے لیکن
چاہتا یہ ہوں کہ ساحل کا بھی احساں نہ ہو

وہ بھی محفل کوئی محفل ہے جہاں پر لوگو
آنے والوں کی ضیافت کے لئے پان نہ ہو

سو رہا ہے جو ترے دل میں تمرؔ مدّت سے
میں یہ ڈرتا ہوں کہ بیدار وہ انسان نہ ہو

(۱۳۶)

بسایا داغِ محبّت سے ہم نے سینوں کو
بنایا رشکِ چمن دشت کی زمینوں کو

پڑا اٹھا دستِ جنوں دامن و گریباں پر
یہ کیا ہوا کہ نہیں چین آستینوں کو

یہ ٹوٹ جاتے ہیں بدلی ہوئی نگاہوں سے
سنبھل سنبھل کے اُٹھا دل کے آبگینوں کو

بُلا سکی نہ انھیں دلفریبیٔ ساحل
طلسمِ موج نے اپنا لیا سفینوں کو

ہمارے داغِ محبت کی تربیت کے لئے
خدا کے واسطے لاؤ کوئی حسینوں کو

ملی نظر سے نظر دل نے ساتھ چھوڑ دیا
ہم آزما چکے خوب اپنے ہم نشینوں کو

یہ کچھ نہیں ہے فقط حیلۂ رقابت ہے
تمرؔ سمجھتے ہیں کچھ ہم بھی نکتہ چینوں کو

(۱۳۷)

دامن کا ذکر چاکِ گریباں کی گفتگو
در پردہ ہے تغافلِ جاناں کی گفتگو

اللہ رے بلندیٔ انساں کہ عرش پر
کل رات کو تھی حضرتِ انساں کی گفتگو

اہلِ جنوں میں آمدِ فصلِ بہار تک
ہوتی رہے گی لذّتِ زنداں کی گفتگو

اِک طنز ہے کشاکشِ دورِ حیات پر — گلشن کا ذکر ہو کہ بیاباں کی گفتگو
اے ہم زباں قفس کے اسیروں کے سامنے — جائز نہیں ہے فصلِ بہاراں کی گفتگو
واقف نہیں جو شینِ شعورِ حیات سے — ان کے لبوں پہ ہے غمِ دوراں کی گفتگو

قابو نہ رہ سکا دلِ دیوانہ پر تمیزؔ
چھیڑی جو اس نے زلفِ پریشاں کی گفتگو

(۱۳۸)

میں بُرا کہتا ہوں کیسے کہ نہ سمجھانے کو — 'اسقدر ہوش کہاں عشق کے دیوانے کو'
اس نگاہِ غلط انداز کے صدقے جس نے — سیکڑوں رنگ دیئے ہیں مرے افسانے کو
جل گیا خود سے کہ مہجورِ تپش تھا ورنہ — شمعِ محفل نے جلایا نہیں پروانے کو
منحصر عمر پہ ہوتی نہیں انسان کی موت — وقت کی بات ہے کچھ کہئے نہ مرجانے کو

دِل یہ کہتا ہے تمیزؔ ضبط نہ کر پائیں گے
گوشِ دل سے جو سُنیں گے وہ مرے افسانے کو

(۱۳۹)

پردے سے حسنِ یار کہیں جلوہ گر نہ ہو — ڈرتا ہوں مجھکو شکوۂ تابِ نظر نہ ہو
حسرت کا داغ دل میں جلے صورتِ چراغ — بس اتنی آرزو ہے کہ سنسان گھر نہ ہو
کس کی نظر سے بارشِ پیکاں ہے رات دن — شبہ ہمارے دل کو کہیں آپ پہ نہ ہو
صیاد احتیاط سے مجھکو اسیر کر — 'تنکا بھی آشیاں کا اِدھر سے اُدھر نہ ہو'

اخفائے رازِ عشق کی تاکید خوب ہے
دل کی ہی واردات ہو دل کو خبر نہ ہو

آئینہ جمال نہیں عین حسنِ ذات
میں ماجرا کہوں تو کہیں دردِ سر نہ ہو

میری نگاہِ شکوہ طلب تک ہے ناگوار
نظروں سے ایسی چوک ثمرؔ بھول کر نہ ہو

(۱۴۰)

جس سے جی چاہے اس سے پیار کرو
مجھکو لیکن نہ بیقرار کرو

تم سے کہتا ہوں تم پہ مرتا ہوں
مرد کا کچھ تو اعتبار کرو

مجرمِ عشق وہ بھی ہیں لیکن
اُنکو ہرگز نہ سنگسار کرو

ق

قاضیو! مفتیو! تم ان کی جگہ
آج مجھ کو سپردِ دار کرو

تم توجہ اگر نہیں کرتے
کچھ مداوائے حالِ زار کرو

وہ تمہارے بھی ہو رہیں گے ثمرؔ
اور کچھ روز انتظار کرو

(۱۴۱)

ملی ہے میراثِ قیس و فرہاد عشق کے گلستاں سے ہمکو
تعلقِ خاطر اِس لئے ہے بہار کی داستاں سے ہمکو

نظر میں ہے منزلِ محبت خیال دار و رسن نہیں ہے
غرض نہیں مسلکِ وفا میں فریب سود و زیاں سے ہم کو

ہماری تنہائی سفر پہ نگاہِ رہزن کبھی نہ جاتی
ہزاروں خطرے ہوئے ہیں لاحق تعلقِ کارواں سے ہمکو

یہی زمیں ہے ہمارا موضوع اسی زمیں کے قصیدہ خواں ہم
نہ مہر و انجم سے واسطہ ہے نہ ربط ہے کہکشاں سے ہم کو

ہم اپنی تقدیر پہ ہیں قانع ثمرؔ ہمارا یہی ہے مسلک
نہ اُن سے شکوہ نہ ہے شکایت رقابتِ آسماں سے ہمکو

(۱۴۲)

مبتلائے غمِ دلدار نہ ہو | یا الٰہی کوئی بیمار نہ ہو
درِ خورِ غور ترحّم بھی ہے | اس قدر خوگرِ آزار نہ ہو
بیوفائی کی شکایت کیسی | بیوفائی ترا کردار نہ ہو
کون جانے ترے دلمیں کیا ہے | کہیں انکار ہی اقرار نہ ہو
کیوں اٹھائے ترے غم کی زحمت | دل اگر خوگرِ ایثار نہ ہو
آج برہم ہے مزاجِ ہستی | داستاں پھر کوئی تیّار نہ ہو

مرچکا جذبۂ منصور ثمرؔ
اہتمامِ رسن و دار نہ ہو

(۱۴۳)

راہِ وفا کے سنگِ گراں رولتے چلو | بھاری ہے غم کا بوجھ ذرا بولتے چلو

وارفتگانِ عشق بدستِ جنونِ عشق
شہر معاشیات کے در کھولتے چلو

اے طائرانِ کنجِ قفس آتی ہے بہار
اپنی حدوں میں رہ کے بھی پَر تولتے چلو

شکوہ رہے نہ تلخیٔ لیل و نہار کو
تریاکِ ذوق ہم نفسو گھولتے چلو

ممکن ہو گر تو فکر کے صحراء میں گاہ گاہ
تم گوہرِ سخن کو ثمر رولتے چلو

(۱۴۴)

رکو تو یوں نہ کسی ہم سفر کے دل پہ کھلو
چلو تو یوں کہ زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اسی کو ڈس لو سیاست کا یہ تقاضا ہے
وہ جس کے ظلِّ حمایت میں ایک عمر پلو

نکھارنا ہے اگر تم کو رنگ گلشن کا
تو خاک پائے خزاں ہر کلی کے منہ پہ ملو

شباب و شوق کی رعنائی تو مبارک ہو
تم اپنے گلشنِ نخوت میں خوب پھولو پھلو

ثمر یہی ہے گناہِ وفا کا کفّارہ
کہ اپنی آگ میں تا عمر اسی طرح سے جلو

(۱۴۵)

کاجل آنکھوں میں لگا کر سرِ بازار نہ جاؤ
مجمعِ عام میں لیکر کھلی تلوار نہ جاؤ

ان سے کہتی ہے حیا وعدہ خلافی ہی سہی
بدلہ لینے پہ شبِ وصل ہے تیار نہ جاؤ

آخر ہو ہی گیا تم پہ بھی پری کا سایہ
میں نہ کہتا تھا مری جاں پسِ دیوار نہ جاؤ

یہ بھی تو گھر ہے کوئی بن نہیں رہ جاؤ یہیں
رات اندھیری بھی ہے بارش کے ہیں آثار نہ جاؤ

کوئی فتنہ نہ کھڑا کر دیں رقیبانِ کہن
بیچنے کے لئے اس کوچے میں اخبار نہ جاؤ

دم اُلجھ جائے گا ہو جائیگا جینا دشوار
چھوڑ کر مجھ کو اکیلا مرے سرکار نہ جاؤ

جس کو آسان سمجھ رکھا ہے وہ بازئ عشق
کبھی سوچو تو سہی تم ہی کہیں ہار نہ جاؤ

آج کی رات ہمارے بھی چمک جائیں نصیب
ہم بھی جی بھر کے تمہیں کر لیں ذرا پیار، نہ جاؤ

(۱۴۶)

کبھی تو نازِ کیف و کمٌ اٹھاؤ
محبت کر کے دیکھو، غم اُٹھاؤ

نہ ہو جب مسئلہ کوئی بھی پیدا
سوالِ عزتِ آدم اُٹھاؤ

وفا داری کی پہلی شرط یہ ہے
ہمارے نام کا پرچم اُٹھاؤ

پریشاں خاطری تم کو مبارک
یہ بارِ گیسوئے برہم اُٹھاؤ

بنامِ آبروئے ہمتِ دل
زمانے بھر کا تنہا غم اُٹھاؤ

خدا کے واسطے محشر خرامو!
اُٹھاؤ فتنے لیکن کم اُٹھاؤ

قمر کی طرح فرشِ میکدہ پر
کبھی تو لطفِ جامِ جم اُٹھاؤ

(۱۴۷)

یارب مری طرح بھی کوئی بے زباں نہ ہو
دل جل رہا ہو اور لبوں پر فغاں نہ ہو

یہ جستجوئے دیر و حرم رائگاں نہ ہو
وہ جانِ کائنات کہاں ہو کہاں نہ ہو

اے عندلیب ایسی روایت سُنی نہیں — برباد فصلِ گل میں کوئی آشیاں نہ ہو
مجھ سے نہ پوچھ حال مرا سب کے سامنے — ڈرتا ہوں میں کہ دلکی مخالف زباں نہ ہو
منحوس گھر ہے کہتے ہیں سب لوگ دل جسے — یارب یہاں پہ کوئی تمنّا جواں نہ ہو
اظہارِ مدعا میں تامّل ہے اس لئے — اک حرفِ شوق بڑھ کے کہیں داستاں نہ ہو
شہرِ بتاں کو چھوڑ کے سوئے حرم چلو — ممکن ہے رسمِ جور یہاں ہے، وہاں نہ ہو
میں تو رہوں گا چپ مگر اس کا ہے کیا یقیں — روئدادِ غم نظر کی زبانی بیاں نہ ہو
تمکو حجاب مجھکو تکلّف بوقتِ وصل — کیا لطف ہے جو لُطفِ سخن درمیاں نہ ہو
دل بیچ تو رہا ہوں نظر کے عوض مگر — یہ بھی خیال ہے کہ یہ سودا، گراں نہ ہو

پابندئ رضا پہ نظر میں ہوں کاربند
اس کی نہیں ہے فکر زیاں ہو زیاں نہ ہو

(۱۴۸)

بسکہ میں تنگِ تقاضائے نظر ہوں یارو — جسکو پڑھتا نہیں کوئی وہ خبر ہوں یارو
طنز کرتے ہیں عبث میرے گناہوں پہ لوگ — میں فرشتہ تو نہیں پھر بھی بشر ہوں یارو
تنگِ احساس ہوں بے روح بدن کی مانند — جس میں رہتا نہیں کوئی میں وہ گھر ہوں یارو
مجھکو پہچانا گیا سنگِ ملامت کے طفیل — جو ہے ممنونِ مو ثر وہ اثر ہوں یارو
غم کے آنگن میں ہوں شبنم زدۂ احساسات — غور سے دیکھو مجھے دیدۂ تر ہوں یارو
ہو جو ممکن تو نوازیں مجھے اربابِ جمال — میں بھی اک شاعرِ بدنام نظر ہوں یارو

مجھکو کہتے ہیں ثمرؔ وارثِ میراثِ سخن
باعثِ فخر صنا دیدِ ہُنر ہوں یارو

'ھ'

(۱۴۹)

(غیر منقوط ۔ صنعتِ مہملہ)

اِس دل کو راس آئی ہے اُس دل سے رسم و راہ
گِل کی ہوئی ہے مادّہ گِل سے رسم و راہ

اک دوسرے کی حدِّ عمل ہے الگ الگ
لہروں کی اس طرح کی ہے ساحل سے رسم و راہ

ہلکا ہی سا سہی وہ مگر عکس لے گا ہاں !
ہے مہر کی اگر مہ کامل سے رسم و راہ

معلوم اس کا حال کسے ہے سوا مرے
ہر روگ کی ہوئی ہے مرے دل سے رسم و راہ

عالم ہے اور دل کا کہ وا ہے درِ مراد
ہے سارِم ادا کی مرے دل سے رسم و راہ

(۱۵۰)

مرے ساقی مجھے دے گلنار بادہ عطا دن بھر میں ہو سولہ بار بادہ

زمانے سے ہے یہ ہمدم خوف مجھکو — نہ بن جائے مرے حق میں خمار بادہ
جو کچھ دم ہو تو پھر سے اک بار ناصح — مرے آگے کہو ہے بیکار بادہ
مری تنہائیوں کی ہے شام شاہد — اکیلے میں مرا ہے غم خوار بادہ
نگل جائے تعجب کیا جام اس کو — کہیں ساغر سے گر ہو دو چار بادہ
نہ میخانے کا ہو جائے راز افشا — کہوں کس سے گئے پی سب یار بادہ

لقب جس کا جہاں میں ہے روح افزا
ملا مجھکو تمرؔ وہ رس دار بادہ

(۱۵۱)

مٹا احساسِ عرفانِ نظر آہستہ آہستہ — ہوئے دیر و حرم نا معتبر آہستہ آہستہ
بجز تیرِ ستم ایسی نظر کو اور کیا کہئے — جو پہونچی دل سے تا حدِ جگر آہستہ آہستہ
نگاہِ حسن بھی شاید بڑی چالاک ہوتی ہے — کہ جو کر لیتی ہے خود دل میں گھر آہستہ آہستہ
عجب منظر تھا خلوت خانۂ حسن و محبت کا — مری جانب اٹھی ان کی نظر آہستہ آہستہ
ریاضت شانۂ مشاطہ نے کی ایک مدت تک — یہ زلفیں سر سے پہونچیں تا کمر آہستہ آہستہ

ابھی احساس کی دنیا میں اک طوفان اٹھا ہے
اٹھے گا پردۂ رخ بھی تمرؔ آہستہ آہستہ

(۱۵۲)

بہ نگاہِ ساحرانہ بہ ادائے کافرانہ — مجھے کیوں سکھا رہے ہو رہ و رسم عاشقانہ

کبھی برگِ سبز بن کر کبھی سُرخ پھول بن کر
دئے تو نے لاکھ دھوکے بہ غرورِ ساحرانہ

اسے اہلِ دل نہ دیکھیں یہ بھلا کہاں ہے ممکن
جو لہو سے آرزوؤں کے لکھا گیا فسانہ

دلِ مضطرب یہ کیا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے
اُسی کوچۂ محبّت کی طرف ہوا روانہ

تمؔر آج تک نہ بھولی کوئی بزمِ ساز و نغمہ
مری آہِ صبحگاہی مرا نالۂ شبانہ

ھ

(۱۵۳)

دغا بھی کریں اگر وہ کہیں دغا نہ سمجھ
جفا جو کریں اُسے تو کبھی جفا نہ سمجھ جفا نہ سمجھ

اگرچہ ملے تجھے غم دل کسی سے کبھی گلہ نہ تو کر
بُرا جو کوئی کرے تو اُسے بُرا نہ سمجھ بُرا نہ سمجھ

ملے گا تجھے بتوں سے نہ کچھ تمؔر بخدا
صنم تو صنم صنم کو کبھی خدا نہ سمجھ خدا نہ سمجھ

(۱۵۴)

اختصارِ جلوہ ہائے حُسنِ عالمگیر دیکھ
دل کے آئینے میں اس معشوق کی تصویر دیکھ

اے دلِ جلوہ طلب ہشیار ہو ہشیار ہو
سامنے سے آ رہا ہے وہ نظر کا تیر دیکھ

دل تو کیا ہے خاک کا اک ڈھیر باقی ہے تمؔر
حسرتِ ناکام کی اُجڑی ہوئی تعمیر دیکھ

(۱۵۵)

نبیؐ کا نور رہا نورِ بوترابؑ کے ساتھ
یہ آفتاب ازل سے ہے ماہتاب کے ساتھ

سکون چھین لیا تو نے ہائے خواب کے ساتھ
بسر تو ہوتی ہے لیکن اب اضطراب کے ساتھ

قیامت آئے کہ ہم انتظار کرتے ہیں
نگاہ الجھی ہوئی ہے ترے نقاب کے ساتھ

جمالِ پردہ نشیں کی تلاش میں اے دل
تمام رات پھرا ہوں میں آفتاب کے ساتھ

کسی کی چشمِ فسوں گر کا ذکر ہوتا ہے
غضب ہے بے ادبی ساغرِ شراب کے ساتھ

سمجھ میں معنیٔ رحمت اب آ گئے واعظ
یہ بادہ خوار بھی جنت میں ہے جناب کے ساتھ

تمرؔ غرور بھی زیبا ہے اس بشر کیلئے
خدا نے حسن دیا ہو جسے شباب کے ساتھ

(۱۵۶)

دل ہر مقام پہ تھا برابر زباں کے ساتھ
ثابت قدم تھا جذبِ محبت بیاں کے ساتھ

منزل کا ذکر کیا ہے کہ راہِ طلب میں ہم
دو چار گام چل نہ سکے کارواں کے ساتھ

یارب سکون و صبر کی دولت بھی لٹ گئی
آئی ہے یہ بلا بھی غمِ ناگہاں کے ساتھ

کچھ ایسے مبتلائے غمِ زیست تھے کہ ہم
انصاف کر سکے نہ غمِ دوستاں کے ساتھ

یادش بخیر دل کی ہوئی پھر مجھے تلاش
رشتہ جڑا نگاہ کا پھر آسماں کے ساتھ

مائل بہ شر ہے آپ کی فطرت جنابِ شیخ
کیسے نبھے گی خلد میں کرّوبیاں کے ساتھ

غم کی تھکن سے ہجر کی شب نیند آ گئی
کچھ دور چل سکے نہ تمرؔ کہکشاں کے ساتھ

(۱۵۷)

باندھے گئے حسینوں کے جبدم حنا سے ہاتھ
خود بڑھ کے زندگی نے ملایا قضا سے ہاتھ

ہاتھ آئی ہمکو دولت دردِ جگر گداز
خالی نہ لوٹے یونہی درِ مدعا سے ہاتھ

مشقِ جفا سے ہاتھ اٹھالیں جو اہلِ حسن
دھو بیٹھیں ہم بھی جرمِ الم میں وفا سے ہاتھ

کھلتی نہیں ہیں غنچۂ گلشن کی مٹھیاں
وابستہ ہیں جو دامنِ بادِ صبا سے ہاتھ

ہر آرزوئے زخم بمشرؔ بے ثمر ہوئی
ہے بے نیاز ناخنِ عقدہ کشا سے ہاتھ

(۱۵۸)

جس کسی نے سیکھ لی ہے رہنمائی فن کے ساتھ
قافلے چلتے رہیں گے بس اُسی رہزن کے ساتھ

میکشوں کی سادہ لوحی جو نہ چاہے سو کرے
شیخ بھی پیتے ہیں مے لیکن کمالِ فن کے ساتھ

ہم نہ کہتے تھے کہ دیوانوں سے چھیڑ اچھی نہیں
کیا کیا دستِ جنوں نے آپ کے دامن کے ساتھ

دیکھئے کب تک شعورِ رہرواں بیدار رہو
قافلے چلتے رہیں گے تابہ کے رہزن کے ساتھ

عشق کا بس حق پہونچتا ہے اسی انسان کو
جس میں یہ ہمت ہو دیکھے آپکو دشمن کے ساتھ

میری وحشت کا اٹھایا فائدہ اغیار نے
میں بمشرؔ الجھا رہا خود اپنے ہی دامن کے ساتھ

'لا'

(۱۵۹)

مرتا ہوں میں دوائے غمِ پیچ و تاب لا   ساقی خدا کے واسطے جامِ شراب لا
قاصد فضول گوئی تو ہے شیخ کا چلن   تمہید بارِ ذہن ہے خط کا جواب لا
ندیاں بجھا سکیں نہ سمندر کی پیاس کو   کہتی ہے موج پھر بھی کہ ساغر حباب لا!
ثابت ہو جس سے ملکیتِ جائدادِ غم   پٹواریانِ عشق سے وہ انتخاب لا

اے ریگ زارِ جبر ثمرؔ کی ہے آرزو
تنہائی تمام کا کوئی جواب لا

(۱۶۰)

لا دوائے خلوتِ غم، تقدیر لا   خانۂ دل میں تو اُنکی، تصویر لا
ہو کے جو پیوست ہرگز، نکلے نہ اب   ناوک افگن دل کی خاطر، وہ تیر لا
جستجوئے حوصلہ رس، یہ عرض ہے   آفتابِ زندگی کی، تنویر لا
آسماں سے صبر والے، کہتے ہیں یہ   اک مصیبت نو بہ نو پھر، بے پیر لا

چومنے اک سنگِ در کو، آئے ثمرؔ
شیخ ممکن ہو تو ان پر، تکفیر لا

'د'

(۱۶۱)

ہم نہ جو ہوتے کہیں محرمِ ارض و سماء
کون اُٹھا سکتا تھا یہ غمِ ارض و سماء

سنّتِ تخلیق ہے کتنی قدامت پسند
صبحِ ازل سے ہے ایک موسمِ ارض و سماء

جلوۂ تعمیر میں صورتِ تخریب دیکھ
تیری نظر ہے اگر محرمِ ارض و سماء

چاہے تو یہ دے بدل قاعدۂ کائنات
دستِ الٰہی میں ہے خاتمِ ارض و سماء

باعثِ تقریب ہے انکے تفاوت کا راز
محفلِ روحانیاں محرمِ ارض و سماء

لذّتِ عشرت ہے بس از پئے اہلِ نشاط
قسمتِ اربابِ غم ماتمِ ارض و سماء

روزِ قیامت ثمرؔ اس کا بنے گا گواہ
دم سے ہمارے تھا بس یہ درمِ ارض و سماء

'ی'

(۱۶۲)

بیکسِ غم نہ زمانے میں ہوا ایسا کوئی
آج کی رات بیاباں میں ہے تنہا کوئی

مجھ سے وحشت میں ہوئے جیب و گریباں رخصت
کب بُرے وقت میں ہوتا ہے کسی کا کوئی

طلبِ جلوۂ محبوب کی قیمت ہے خودی
طور پر دیکھ لے پھر کرکے تقاضا کوئی

یہ اُسی سمت کو جائیں گی جدھر کی ہو ہوا
ان بہاروں کا نہیں مجھکو بھروسا کوئی

کسی میخانے میں کل آپ سے ملتا جلتا
ہم نے دیکھا ہے ثمرؔ غم کا سراپا کوئی

(۱۶۳)

نگاہِ شوق کی آشفتہ سامانی نہیں جاتی — کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
تمہارا حسنِ عریاں میں نے خود دیکھا ہے پھولوں میں — خطا جس کی بھی ہو میری پشیمانی نہیں جاتی
یہاں بھی بادہ نوشی میں تکلف اس کے کیا معنی — لبِ کوثر بھی واعظ تیری من مانی نہیں جاتی
وہ جلوہ تھا کہ در پردہ طلسمِ جلوۂ جاناں — قیامت ہے کہ آئینے کی حیرانی نہیں جاتی

ثمرؔ کیا ہو گیا تم کو یہ آخر ماجرا کیا ہے
ہجومِ غم میں بھی خوئے غزل خوانی نہیں جاتی

(۱۶۴)

جسدم کمانِ ابروئے مہوش کڑک گئی — برسے وہ تیر دل پہ طبیعت پھڑک گئی
افسردہ خاطری میں جو چھیڑا گیا مجھے — چنگاری اک بجھی سی دبی تھی بھڑک گئی
دشتِ غم و الم سے گذرنا پڑا اسے — تا منزلِ جمال و حیا جو سڑک گئی
وہ اعتدال فکر و نظر اب کہاں کہ آج — احساس کے بدن کی کوئی نس تڑک گئی

دیکھا ثمرؔ نے آنکھوں سے بادل برس گئے
جب بھی خیالِ یار کی بجلی کڑک گئی

(۱۶۵)

سر دیر و حرم پھر مکر و فن کی آزمائش ہے — مذاقِ فکرِ شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

ابھی ناپختہ ہیں احساسِ خودداری کے پیمانے
تصور کے سبوئے نغمہ زن کی آزمائش ہے

کہاں ہیں مطربانِ نغمۂ سازِ انا آئیں
سنا ہے دار پہ پھر بانکپن کی آزمائش ہے

جو پنہاں ہے ابھی تک سینۂ خورشیدِ زریں میں
ہمارے غمکدے میں اس کرن کی آزمائش ہے

نگاہِ التفاتِ حسن بھی ہے برقِ بربادی
نئے انداز سے چرخِ کہن کی آزمائش ہے

جو آئیگا ہمارے جی میں کہہ گذریں گے کیا پروا
سرِ طور آج مرگِ یک سخن کی آزمائش ہے

سرِ راہِ محبت رہبری کے واسطے پھر سے
قمر کی قیس کی اور کوہکن کی آزمائش ہے

(۱۶۶)

اب زخمِ جگر مائلِ فریاد نہیں ہے
شاید کہ مجھے شکوۂ بیداد نہیں ہے

اے شمع یہ ہے تیرے پتنگے کا جنازہ
کل رات کی ہے بات تجھے یاد نہیں ہے

میں سامنے ہوں اور لبِ حسن ہیں خاموش
شاید کہ ابھی فرصتِ ارشاد نہیں ہے

احساس کی دنیا میں تلاطم ہے کہ مجھکو
اذنِ ہوسِ لذتِ فریاد نہیں ہے

ہیں کوہِ گراں آج بھی وادئ وفا میں
اس دور میں لیکن کوئی فرہاد نہیں ہے

اُس وعدہ فراموش سے کیونکر ہو شکایت
جو ہنس کے یہ کہدے کہ "مجھے یاد نہیں ہے"

میں سیکھوں تو کس شخص سے آدابِ محبت
اس فن کا قمر کوئی بھی استاد نہیں ہے

(۱۶۷)

آرزو کہتے ہیں کس کو یہ تمنّا کیا ہے — خلشِ دردِ جگر اے دلِ شیدا کیا ہے

ہم یہ سمجھے تھے کہ آساں ہے محبّت کرنا — ہمکو معلوم نہ تھا عشق میں ہوتا کیا ہے

محرمِ آہ ہے خلوت کدۂ ذوقِ نماز — ورنہ سجادۂ طاعت پہ تڑپنا کیا ہے

تم کو معلوم نہیں عشق کی دنیا ہے وسیع — ابھی کم عمر ہو تم نے ابھی دیکھا کیا ہے

ہم تو کچھ اور ہی سمجھے ہیں تمنؔ لیکن تم
یہ بتاؤ کہ محبّت کا تقاضا کیا ہے

(۱۶۸)

مری عریاں تنی تجھکو پیامِ سازگاری ہے — مبارک دشتِ وحشت! دامنِ جاناں کی باری ہے

وفورِ اضطرابِ شوق بھی کیا چیز ہے لوگو — گماں ہوتا ہے ہر محمل میں لیلیٰ کی سواری ہے

بجھا ہے کس کا دل یا رب تمناؤں کی منزل میں — اُداسی ہی اُداسی عالمِ امکاں پہ طاری ہے

نگاہِ حسن اب تک ہے ستم نا آشنا لیکن — غمِ دوراں کی اربابِ جنوں میں پردہ داری ہے

عبث دیر و حرم بدنام ہوتے ہیں تمنؔ ورنہ
یہاں شیخ و برہمن آپ ہی اپنا پجاری ہے

(۱۶۹)

ذوقِ ناکامی ابھی تشنہ ہمارے دل میں ہے — زندگی کا راز پنہاں سعیٔ لاحاصل میں ہے

اس لئے صحرا نوردی بھی ہے لذّت آفریں — دشت کی وسعت بھی شامل جادۂ منزل میں ہے

ہو نہ پائی آج تک مرہونِ لبِ ممنونِ گوش　　وہ جو اک عرضِ تمنا مدتوں سے دل میں ہے
اب بھی آنا ہے تو آجاؤ کہ میں ہوتا ہوں خاک　　کاروانِ آرزو وادیٔ آب و گل میں ہے
کھل نہیں پاتے ہیں دونوں یہ ہے طرفہ ماجرا　　ورنہ جو کچھ آپ کے دل میں ہے، میرے دل میں ہے
ماضی و حالِ محبت دیکھتے آئے ثمرؔ
وہ بھی دیکھیں گے کہ جو تقدیر مستقبل میں ہے

(۱۷۰)

کسی کا حسن عیاں شیشۂ حواس میں ہے　　پسِ نقاب ہے لیکن حدِ قیاس میں ہے
کمالِ ذوقِ ستم اور کمالِ ضبطِ جنوں　　ترے لباس میں ہے اک مرے لباس میں ہے
کسی کو تشنہ لبی کی نہیں شکایت اب　　خلاصۂ مے و میخانہ میری پیاس میں ہے
ہے داغِ دامنِ مجبوریٔ بشر اے دوست　　وہ بیکسی کہ جو اک حرفِ التماس میں ہے
ہمیں امیدوں کے جھرمٹ میں مل نہیں سکتا　　سکونِ دل جو میسر ہجومِ یاس میں ہے
ثمرؔ حدیثِ غمِ روزگار کا حاصل
ہمارے قصۂ رنگیں کے اقتباس میں ہے

(۱۷۱)

دیر کو شیخ اور حرم کو برہمن درکار ہے　　از سرِ نو یعنی تنظیمِ چمن درکار ہے
انتہائے عقل ہے حدِ جنوں کی ابتدا　　ہوش کو بھی کچھ نہ کچھ دیوانہ پن درکار ہے
جو مٹا دے یادِ ماضی کے نقوشِ غم فزا　　میرے ساغر کو وہ صہبائے کہن درکار ہے

میں سمجھتا ہوں مرے افسانۂ غم کو ہنوز
سرخیٔ خونِ جگر کا بانکپن درکار ہے

اے زمینِ شورِ گلشن شرم کرنا چاہیئے
اک گُلِ دشت آفریدہ کو چمن درکار ہے

سخت مشکل ہے غزل گوئی ثمرؔ اس کے لئے
میرؔ کا انداز اور غالبؔ کا فن درکار ہے

(۱۷۲)

شکوہ کسی سے ہے نہ شکایت کسی سے ہے
مجھکو گلہ بشر کی بشر دشمنی سے ہے

اس سے نہیں غرض کہ جلا کس کا آشیاں
اہلِ چمن کو کام فقط روشنی سے ہے

دل ابتدائے دورِ جوانی میں بجھ گیا
خاموش یہ چراغ سرِ شام ہی سے ہے

یہ اہتمام بادہ و مینا یہ دورِ جام
اک رند تشنہ کام کی دریا دلی سے ہے

ساقی ترے نظام پہ رکھتا نہیں میں حرف
توہینِ میکدہ مری تشنہ لبی سے ہے

کھیلی تھی جو لبوں سے کبھی وقتِ التفات
رونے کا سلسلہ اسی پہلی ہنسی سے ہے

اتنی غمِ حیات سے فرصت کہاں ثمرؔ
الفت کسی سے ہے نہ عداوت کسی سے ہے

(۱۷۳)

مری نظر میں اگر تیرا آستاں نہ رہے
تو ذوقِ سجدۂ تسلیم کامراں نہ رہے

جو اعتبار پہ قائم نہ ہو نظامِ جہاں
کوئی کسی کا زمانے میں رازداں نہ رہے

سُنا ہے حسُن کو بھی ہے یہ فکر دامنگیر
کوئی سکون سے اب زیرِ آسماں نہ رہے

یہ آرزو بہ تقاضائے عشق ہے میری
خدا کرے کہ کوئی تم سے بدگماں نہ رہے

تمنّؔ یہ وقت کی خوبی یہ ہے نصیب کی بات
جو مہربان تھے کل تک وہ مہرباں نہ رہے

(۱۷۴)

جو حرفِ آہ سرِ جادۂ زباں گذرے
مزاج یار پہ شاید بہت گراں گذرے

ہماری دشت نوردی پہ کیوں تعجب ہے
اسی طرف سے کئی اور کارواں گذرے

طوافِ دیر و حرم دونوں ہی ضروری ہیں
کہاں نہ گذرے مری زندگی کہاں گذرے

غمِ حیات بہت کچھ سکون ہے تجھ سے
وہ چند لمحے جو فرصت کے تھے گراں گذرے

متاعِ ہوش و دل و زندگی گنوا بیٹھے
تمہارے شہر سے جو لوگ ناگہاں گذرے

مجھے تلاش رہی غمگسار کی بے سود
تمنّؔ حیات کے دن یونہی رائگاں گذرے

(۱۷۵)

آکے بالیں پہ غمگسار چلے
ڈوبتی نبض کو ابھار چلے

تم بتاؤ کہ کیا کرے کوئی
جبر پہ جب نہ اختیار چلے

ہمسفر دیکھیں اور کتنی دور
راستے کا غریب بیمار چلے

جب کہیں پر نہیں وجودِ چمن
کس جگہ بادِ نو بہار چلے

مجھکو دے یا نہ دے مگر ساقی
بزم میں جام بار بار چلے

کتنے بے صبر ہیں وہ دیوانے بن بلائے جو سوئے دار چلے
میکشی کا یہی تقاضا ہے کھاتہ کھُل جائے اور ادھار چلے
میکدے سے جنابِ شیخِ حرم آج ہو کر ذلیل و خوار چلے
تم بھی تمرؔ چپ رہو خدا جانے
تا بہ کے دورِ انتشار چلے

(۱۷۶)

آیا نہ کام پردہ اس نازنیں بدن کے باہر نکل رہا ہے پردے سے نور چھن کے
پروانہ جان دے گا اور شمع بھی جلے گی اپنی جگہ پہ دونوں ہیں اپنے اپنے من کے
فطرت بدل سکے گی ہرگز نہ آدمی کی قائم رہیں گے جھگڑے یزدان واہرمن کے
مجھکو شکست توبہ آواز دے رہی ہے پھر میکدے میں واعظ رنگین جام کھنکے
احساسِ شرمِ احساں مرکر بھی مٹ نہ پایا احسان مند ہم ہیں زیرِ لحد کفن کے
ذہنِ تمرؔ سلامت احساسِ غم سلامت
اب تک نقوش باقی ہیں یادِ انجمن کے

(۱۷۷)

جس پہ تیری نگاہ ہو جائے وہ نہ کیسے تباہ ہو جائے
کیا کرے وہ کہ جس کی آنکھوں میں روزِ روشن سیاہ ہو جائے
آج پھر گھر کے آئے ہیں بادل آج پھر اک گناہ ہو جائے

دل کو مدّت سے یہ تمنا ہے
آپ سے رسم و راہ ہو جائے
شعلۂ و گل پہ کچھ نہیں موقوف
جس کو جس شے کی چاہ ہو جائے
خوگرِ غم رہو نجمؔ تا زیست
یوں بھی شاید نباہ ہو جائے

(۱۷۸)

خدا رکھے جمالِ دردِ پنہاں دیکھنے والے
ابھی زندہ ہیں اپنے دل میں پیکاں دیکھنے والے
صبا کو موجِ بوئے گل کو دودِ شمع محفل کو
پریشاں خود نہ ہو جائیں پریشاں دیکھنے والے
سر آئینہ خانہ ہے نظر کی کار فرمائی
بنا دیتے ہیں آئینہ کو حیراں دیکھنے والے
دیارِ زلف میں ہے اجنبی دل دیکھ لیں آکر
سبا میں بے نوائی سلیماں دیکھنے والے
ہوئے بیہوش ایسے صورِ اسرافیل سے چونکے
نجمؔ مرقد میں نورِ حسنِ جاناں دیکھنے والے

(۱۷۹)

بُرا کیا تمہیں چاہا جو مہرباں میں نے
بنایا جلتی ہوئی آگ میں مکاں میں نے
بنایا نورِ جہاں تمکو بے گماں میں نے
بنا میں جسم نقب دیکے تمکو جاں میں نے
کہا جو تو نے کہ لازم ہے ضبطِ غم تو اے دوست
پہنا دیں ذوقِ گزارش کو بیڑیاں میں نے
سکوتِ شب میں ستاروں کی خوابگاہوں میں
تجھے تلاش کیا ہے کہاں کہاں میں نے
سہارا لیکے ترے غم کا اے غمِ جاناں
لگائیں گردشِ دوراں کو سیلیاں میں نے

گلوں کی جان سے دور آفت چمن ہمدم
سمیٹ لی ہیں نشیمن میں بجلیاں میں نے

گئے ہیں آگ کے شعلے چمن کی سرحد تک
قفس میں بھولے سے کی ہے اگر فغاں میں نے

جنوں کے نام پہ مانگی جو مجھ سے حُسن نے بھیک
تو قہقہوں سے بدل لی ہیں سسکیاں میں نے

تھا جس پہ قفل لگانے کا اہتمام بلیغ
دہن میں غیر کے رکھدی وہی زباں میں نے

ترے وقار کی خاطر کبھی ہنسا بھی ہوں
غموں کو یوں بھی کیا ہے کبھی نہاں میں نے

تم اور مجھ سے طلب کر رہے ہو خون اسکا
جس آرزو کو کیا پال کر جواں میں نے

کہاں ہیں شیخ و برہمن بنالیں دیر و حرم
جبیں سے توڑ دیا سنگ آستاں میں نے

نہ واعظوں میں کسی کو وہ اتحاد ملا
جو میل دیکھا ہے رندوں کے درمیاں میں نے

کسی کو رازِ محبّت کی ہو سکی نہ خبر
چھپا لی آہ کے دامن میں داستاں میں نے

علاج ہو گیا آشفتہ خاطری کا ثمرؔ
نہیں، کے بعد سنی اُن کے منھ سے ہاں، میں نے

(۱۸۰)

مر کے مقتل میں رہے جیتے جی زنداں میں رہے
ہم بہر طور ثمرؔ حلقۂ جاناں میں رہے

اس لئے شمع جلائی ہے کہ پروانے آئیں
ہم نفس کوئی ہمارا شبِ ہجراں میں رہے

ہم نے بھی رسمِ حسینانِ جہاں دیکھی ہے
دوستو! ہم بھی بہت شہر نگاراں میں رہے

کیجئے بیکسیٔ دستِ جنوں کا ماتم
حیف اس ہاتھ پہ جو فکرِ گریباں میں رہے

صورتِ خالِ رُخِ حسن بُرا کیا ہے شیخ
شائبہ کفر کا تھوڑا سا جو ایماں میں رہے

اہلِ دنیا کی طرح اے غمِ جاناں افسوس — ہم بھی اک عمر فریبِ غمِ دوراں میں رہے
کس طرح شیخ کا کردارِ گذشتہ دیکھیں
برسوں ہم بھی تو تہِ محفلِ خوباں میں رہے

(۱۸۱)

وہ چھین کے میری بینائی جلوہ اپنا دکھلا بھی گئے
یوں عقدۂ ہستی کو میرے سلجھا بھی گئے اُلجھا بھی گئے

اس بات کو کوئی کیا جانے اس راز کو کوئی کیا سمجھے
وہ سامنے میرے آ بھی گئے شرما بھی گئے کترا بھی گئے

کیفیتِ ہوش و بیہوشی دونوں ہے شرابِ الفت میں
اس کو پی کر بیخود بھی ہوئے خود کو کھویا اور پا بھی گئے

تقدیر سے لڑنا کھیل نہیں محرومِ نظر کا غمخوار دو!
ہم ہوش میں اپنے آ نہ سکے اور آنے والے آ بھی گئے

بیتابئ دل کام آ ہی گئی آخر میں محبت والوں کے
خود ہو کے وہ خوش واپس بھی گئے دل اپنا تہِ بہلا بھی گئے

(۱۸۲)

فرازِ طور پہ موسیٰ زمیں پہ ہم سے دیوانے — قریبِ منزلِ جاناں ہے کون اسکو خدا جانے
انھیں کے دم سے قائم رونقِ گلزارِ عالم ہے — تری خاطر بسائے ہیں جنھوں نے مر کے ویرانے

یہ مانا جل گئے سوزِ غمِ عشق و محبّت سے ‏ مگر جو شمع پہ گذری اُسے کیا جانیں پروانے
یقیناً چاک ہو جاتا فریبِ حُسن کا پردا ‏ نہ رکھ لیتے جو عزّت دیر و کعبہ کی یہ میخانے
بہارِ حُسن کی شاید نمائش ہونے والی ہے ‏ اسیرِ گیسوئے مشکیں کئے جاتے ہیں دیوانے
مرے خونِ تمنّا نے جنھیں بخشی ہے رنگینی ‏ تمہاری بزم میں دہرائے جاتے ہیں وہ افسانے
تمرؔ دردِ محبّت عرض کے قابل نہیں ہوتا ‏ لگی ہو جس کے دل کو بس وہی دل کی لگی جانے

(۱۸۳)

آپ کے ہاتھ میں خامہ بھی ہے تحریر بھی ہے ‏ مختصر یہ ہے کہ خود کاتبِ تقدیر بھی ہے
خواب ہے اپنی جگہ اُنکی زیارت لیکن ‏ دیدۂ شوق میں اس خواب کی تعبیر بھی ہے
صورتِ حرفِ غزل عارضِ گلرنگ پہ خال ‏ ایک ہی سطح پہ قرآن بھی تفسیر بھی ہے
تذکرہ جنکا تمرؔ ہوتا ہے مرحوموں میں ‏ اُنھیں آشفتہ سروں میں یہ جواں پیر بھی ہے

(۱۸۴)

زباں نہ کھل سکی طرزِ بیاں کو بھول گئے ‏ تمہارے سامنے ہم داستاں کو بھول گئے
شبِ فراق کا آیا نہ بھول کر بھی خیال ‏ دمِ وصال غمِ رائگاں کو بھول گئے
ستم برنگِ کرم اور کرم برنگِ ستم ‏ تمہارے آگے تو ہم آسماں کو بھول گئے
خوشا تصورِ رنگینیٔ جمال کہ ہم ‏ بہارِ لالۂ ہر گلستاں کو بھول گئے

تمرؔ ملا جو پیامِ غمِ فراق ہمیں
حدیثِ لذّتِ خوابِ گراں کو بھول گئے

سوانحی کوائف

نام: سید وضاحت حسین رضوی
پیدائش: یکم جولائی ۱۹۵۹ء
وطن: قصبہ اور پوسٹ: ہلّور، ضلع سدھارتھ نگر
تعلیم: ایم۔اے۔، پی ایچ۔ڈی۔(اردو)
گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
ملازمت: اسسٹنٹ ڈائرکٹر اطلاعات
انچارج میڈیا سنٹر (وزیر اعلیٰ پریس کیمپس)
ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'
تصانیف: اردو ناولٹ کا تحقیقی وتنقیدی تجزیہ
ہیرے پتھر (علامہ ثمرؔ ہلّوری)
دیوانِ ثمر (علامہ ثمرؔ ہلّوری)
ہندی کے نمائندہ افسانے (زیرِ طبع)
ناولٹ: (انتخاب مضامین) (زیرِ طبع)

پتہ: آر۔ایس ۱۶/۳/۲ ہنکیٹ رائے ایل۔ڈی۔اے۔کالونی
لکھنؤ۔۱۷
رابطہ: دفتر۔۲۲۳۷۰۰۲، ۹۴۱۵۰۰۷۶۹۸
رہائش: ۲۶۴۹۰۴۳
ای۔میل: wazahatrizvi@sify.com
mediacentre2007radiffmail.com



علامہ ثمرؔ بلوری کے ساتھ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی